نہ کرے۔ یعنی ہمکو پھران لوگوں کی جنسے نفرت ہے صورت نہ دیکھنی پڑے۔ تینوں شعروں میں بے کسی کی تصویر کھینچدی ہے۔

ردیف "ہ"

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ　　طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

آفتاب سے لیکر ذرہ تک دل ہی دل ہے اور دل آئینہ کی صورت ہے تو گویا اس طوطی کو ہر طرف سے آئینہ میں اپنی شبیہ نظر آتی ہے۔ طوطی اور آئینہ مشہور مضمون ہے۔ مضمون کچھ ایسا ہے کہ تاویل مشکل ہے یعنی اگر غور کیا جائے تو تمام دنیا متحد بوجود واحد ہے۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ　　جسکی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

میرے گھر میں گریہ وزاری کی نمی سے تمام جگہ سبزہ اُگا ہوا ہے اور یہ گویا میرے گھر کی بہار ہے جس سے ویرانی کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر خیال کیجیے جسکی بہار یہ ہے جو خزاں سے بدتر ہے تو خزاں کی کیا حالت ہوگی۔ مصنف نے سبزہ کے اوگنے کا کئی جگہ اعادہ کیا ہے۔ جیسے کہ

س اُگا ہے گھر میں سبزہ میری ویرانی تماشا کر　　مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

یا اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب　　ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے　　دشواری رہ و ستم ہمرہاں نہ پوچھ

جبوراً ہمکو اب بیکسی کی بھی حسرت اُٹھانی پڑتی ہے۔ یعنی ایسی چیز کی حسرت کرتے ہیں جسکی کوئی حسرت نہیں کرتا۔ مگر بیکسی کو ہم ایسے ہمراہیوں کے ہونے سے اچھا جانتے ہیں جو ظالم ہیں اور جنکی وجہ سے راستہ طے ہونا دشوار ہو گیا ہے۔

مولانا حسرت صاحب نے اسکی یہ شرح لکھی ہے یستم ہمرہاں اس لحاظ سے کہا کہ ان کی موجودگی کے باعث سے بے کسی کی بھی حسرت اٹھانا پڑتی ہے۔ کیونکہ جب لوگ ہمراہ ہیں تو ہم اپنے آپ کو بے کس بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ مطلب بھی اس شعر سے پیدا ہو سکتا ہے بعض جگہ مصرع ثانی اس صورت سے ہے۔ دشواری رہ ستم ہمرہاں نہ پوچھ۔

یعنی راہ ظلم ہمرہاں کا کاٹنا سخت دشوار ہے جس سے ہم بیکسی کی حسرت اُٹھاتے ہیں کہ کاش ہم بیکس ہوتے تو اس راہ کو طے نہ کرنا پڑتا۔

ردیف یا (ی)

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے　　طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

مطلب یہ ہے کہ اگر ہم نظر اُٹھائیں تو جلوہ ہائے گوناگوں دیکھ سکتے ہیں۔ مگر ہم میں طاقت نہیں ہے کہ نظارہ کا احسان اُٹھائیں۔ یہ ہمارے لئے بہت دشوار ہے۔

ہے سنگ پر برات معاش جنون عشق　　یعنی ہنوز منت طفلاں اٹھائیے

معاش جنوں کا فرمان سنگ طفلاں پر لکھا گیا ہے۔ یعنی جنوں کی معاش کا دار و مدار سنگ طفلاں پر ہے اسکے یہ معنے ہیں کہ دیوانہ ہو کر بھی خوشامد اور احسان کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم　　اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

دیوار کا خم ہونا محض مزدور کے بار احساں سے ہے لہذا ہرگز کسی کا احسان نہ اُٹھانا چاہئے دیوار کے خم ہونے کی تمثیل کی تخصیص محض خانماں خراب کی رعایت سے ہے۔ غالب نے بار بار اس مضمون کا اعادہ کیا ہے مگر مختلف صورتوں میں۔ اس سے اونکی عادت پر ایک روشنی پڑتی ہے کہ وہ کیسے غیور تھے۔

س نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم　　کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہے جینا اس سہارے کا

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجیے　　یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھائیے

یا تو میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجیے یعنی لوگوں سے یہ شکایت نہ کرتے پھریے کہ یہ جلتا ہے اور رشک کرتا ہے یا یہ جو رقیبوں کے ساتھ آپ چھپ چھپ کر ہنستے ہیں اس پردہ کو ہٹائیے اور ہنسنا چھوڑ دیجیے۔ زخم رشک کو رسوا کرنا محض پردہ اور تبسم پنہاں کی رعایت سے کہا گیا ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے اور اسکی بندش نہایت چست ہے۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے　　بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

مسجد کو بوجہ محراب وغیرہ کے ابرو سے اور آنکھ کو بہ لحاظ مستی کے میخانہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چنانچہ مصنف بھی ثبوت مین پیش کرتا ہو کہ مسجد کے پاس ایسے ہی شراب خانہ کی ضرورت ہے جیسے آنکھ کے پاس ابرو کی۔ بھوں اگرچہ صحیح ہے اور محاورہ میں یہ مفرد بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر یہاں بہت ہی برا معلوم ہوتا ہو۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر　　آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

آپ بھی ایک اور شخص پر عاشق ہوئے ہین اچھا ہوا میرے اوپر یا دوسرے عشاق پر جور و جفا کی اسکی کچھ سزا ملنا چاہیئے تھی۔ اب اسیطرح اونکو بھی رنج اوٹھانے پڑینگے جیسے کہ مجھے اونکی جدائی مین صدمہ جھیلنے پڑتے ہیں۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسرین جدا جدا　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

یعنی باغ مین انواع و اقسام کے پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں ہر ایک کی بو جدا اور رنگ علیحدہ ہوتا ہے مگر بہار کا ثبوت ہر ایک سے ملتا ہے۔ بہار سب مین پوشیدہ ہے۔

سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بیخودی　　رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

بیخودی کے وقت خم کے پاؤں پر لوٹنا چاہیئے اور مناجات کے وقت قبلہ کی طرف منھ کرنا چاہیئے یعنی ہر وقت حسب موقع وقت کام کرتا رہے۔ نواب مصطفٰے خان صاحب شیفتہ فرماتے ہین۔

ع پانی وضو کو لاؤ رخ شمع زرد ہو　　مینا اٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا

یعنی بہ حسب گردش پیمانہ صفات　　عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

یعنی جس صفت کو دیکھیے اوسی پر ذات کو یاد کرکے مست و بیخود ہو جاہیئے کہ صفت لوازم ذات سے ہے۔

بساط عجز میں تھا اک دل یک قطرہ خوں وہ بھی　　سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

میرے بساط عجز مین محض یک دل تھا وہ دل بھی ایسا جو ایک قطرۂ خوں سے زیادہ نہ تھا اسکی بھی یہ کیفیت ہے ٹپکنے اور بہ جانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے اور وہ بھی سرنگوں ہو کر جس سے پتہ چلتا ہے کہ فوراً بہ جانے والا ہے۔ اسی مضمون کا یہ شعر غالباً علامہ فیضی کا ہو۔

ع دریاب کہ ماندست زدل قطرۂ خونے　　آن قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن

ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اسی سے ترجمہ کیا ہے مگر شان استادی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے فارسی مین محض قطرۂ خون لبریز چکیدن سے ترقی دی ہے غالب نے ترقی در ترقی کا منظر دکھایا ہے بساط عجز۔ اوسمین ایک دل۔ دل بھی ایک قطرۂ خون قطرہ خون بھی آمادہ چکیدن۔ آمادہ چکیدن بھی بحالت سرنگونی۔ دلکو باندازِ چکیدن کہنا لطف سے خالی نہین ہے۔ بہت خوب شعر کہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ چکیدن مصدر فارسی ہے مگر یہاں بے تکلفی سے صرف ہوا ہے اور چنداں برا نہین معلوم ہوتا۔

دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی　　ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیئے

اے فلک کچھ نہ کچھ تو مجھے اون رنج اور غموں کا بدلہ دے کچھ تو مجھے خوشی حاصل ہو دوسرا لطیف پہلو یہ نکلتا ہے کہ اگر کچھ نہیں کرتا تو کم از کم میرے دل حسرت پرست کی داد ہی دے۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

معشوقوں کے لیے ہمنے مصوری سیکھی ہے آخر حصول ملاقات کا کوئی تو ذریعہ چاہیئے کبھی نہ کبھی تو وہ تصویر کھنچوانے کے لیے ہمکو بلائینگے۔ مولانا نظم مصوری کو شاعری کا کنایہ ٹھہراتے ہین۔ فارسی مین فرماتے ہیں۔

ع خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم　　تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

میرا پینے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ نشاط اور سرور ہو۔ بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے ہر وقت ایک بے خودی رہے تاکہ ذرا اپنے غم کو بھولا رہوں۔

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو — خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

یہ ایک قطعہ ہے جسکا پہلا شعر یہ ہے جسمیں مصنف اس بات کے ثبوت میں کہتا ہے جو بات پیدا ہوتی وہ خاموشی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی پہلے آدمی خاموش ہو کر کچھ سوچتا ہے پھر اُن باتوں کا اظہار کرتا ہے تو گویا ہر کلمہ کی اصل خاموشی ہے۔ اور اسکی مثال یہ ہے کہ جڑ سے ٹہنیوں کو طاقت پہونچتی ہے حالانکہ جڑ پوشیدہ ہے اس شعر میں خاموشی کی "ی" دبتی ہے۔ اور یہ مصنف نے بر بنائے قاعدہ فارسی صحیح سمجھا ہے مگر بعض اہل لکھنؤ یائے الفاظ فارسی کا گرانا جائز نہیں قرار دیتے۔ اپنی طبیعت کا ہر شخص مختار ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جب محاورہ میں ے کا گرنا جائز ہے بلکہ بعض جگہ اگر نہ گرائی جائے تو محاورہ بڑا اور بھونڈا معلوم ہوتا ہے تو پھر شعر میں اس قاعدہ کو دیکھتے ہوئے کہ جو کچھ بولو وہی لکھو اسکا گرنا کیوں کر ناجائز قرار دیا جائے سوائے زبردستی کے اور کچھ نہیں۔ اسی لیے آتش وغیرہ نے اسکی پابندی نہیں کی ہے۔ بلکہ متقدمین میں تو اکثر ایسے ہیں کہ انھوں نے الف اور یے داؤ ہی نہیں بلکہ بہت سے حروف کا گرنا عیب نہیں سمجھا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

چند روز از راہ تکلف ہم اپنے معشوق سے آزردہ و رخفا رہے وہ بھی ایک انداز جنوں تھا مصرع ثانی میں جو محاورہ تکلف برطرف استعمال کیا گیا ہے وہ نہایت برمحل صرف ہوا ہے جس سے شعر میں ایک صنعت لفظی یہ پیدا ہو گئی کہ تکلف (یعنی تصنع سے ہم اوس سے آزردہ تھے۔ تکلف کو اٹھا دیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ایک انداز جنون تھا۔ ورنہ معشوق سے آزردہ ہونا اپنے آپ سے آزردہ ہونا ہے۔

خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے — مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

صرف ایک موت کے خیال سے مجھے کیا تسکین ہو سکتی ہے کیونکہ میری تمنا کے جال میں

ایسے ایسے ہزاروں شکار آیا کرتے ہیں۔ ایک معمولی سا شکار یہ بھی ہے۔ یعنی جیسا کہ ایک مشکل کام مرنا ہے اس قسم کے ہزاروں خیال میں کیا کرتا ہوں۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم — کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

اے ہمدم میں نے سمجھا تھا کہ رو کر دل کی بھڑاس نکل جائیگی۔ مگر کیا معلوم تھا کہ رونے سے اور بھی زیادہ دل میں درد پیدا ہو جائے گا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں ہرگز نہ روتا۔ مصرع ثانی میں تین اضافتیں پے در پے آئی ہیں۔ اگرچہ یہ جائز ہے۔ مگر وہیں تک کہ شعر میں لطف اور تازگی باقی رہے۔

نہ اتنا بُرش تیغ جفا پر ناز فرماؤ — مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

غالباً آپ کو ناز ہے کہ میری تیغ جفا کی بُرش نے عاشق کا کام تمام کیا۔ مگر آپ کا یہ ناز قریب قریب بالکل فضول ہے کیونکہ آپ کی تلوار بھی میرے دریائے بیتابی میں ایک موج سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی یعنی بے انتہا ایسی موجیں ہیں جنمیں سے ایک یہ بھی سہی۔ یعنی صرف آپ ہی کی تیغ جفا نے مجھے نہیں مارا بیتابی نے بھی بہت سی تلواریں میرے اوپر چلائیں۔

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے — لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

ساقی گردوں سے شراب عیش کی ہم کیا تمنا کریں۔ کیا ہم دیکھ نہیں رہے کہ دو چار الٹے پیالے لئے بیٹھا ہے شراب عشرت انکمیں کہاں رکھی ہے۔ ایک دو چار سات ہوتے ہیں یعنی سات آسمان بالکل اسی مضمون کا مولانا جامی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر ہے۔

آسمان جام نگوں داں کز مے عشرت تہی ست — جستن مے از تہی ساغر نشان ابلہی است

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ ہجراں — خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غالب میرے دل میں وصل کا شوق اور جدائی کا شکوہ بھرا ہوا ہے خدا کرے کہ جلد وہ دن آئے کہ مجھے اُس سے یہ دونوں سنانے کی نوبت آئے۔

ہی بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آگئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

معشوق اسقدر خوشامد پسند واقع ہوئے ہیں کہ بات ہمارے لبوں سے خفا ہوگئی یعنی اب ہم سے خوشامد نہیں کیجاتی دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ معشوق کے سامنے بوجہ رعب حسن وغیرہ کے لب سے بات نہیں نکلتی اور وہ چاہتی ہے کہ ہم اُس کی خوشامد کریں تب وہ کہیں ہمارے لب تک آئے۔

ہی دورِ قدح وجہ پریشانی صہبا
اکبار لگادو خمِ مے میرے لبوں سے

بار بار پیالہ میں بھرنے سے شراب گرتی ہے اس سے یہ مناسب ہے کہ خمِ مے اکدم میرے منہ سے لگادیا جائے اسکے گرنے سے مجھے نقصان پہونچتا ہے۔ جناب آرزو صاحب لکھنوی فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں

ساقیا نقصانِ جاں پر میر انیض بھول
جتنے قطرے مے کے ٹپکے خون اُتنا جل گیا

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہونا طرف ان بے ادبوں سے

اے زاہد وہ رندان بادہ نوش جو شب و روز میخانہ کے در پر رہتے ہیں کہیں ان کا مقابلہ نہ کر بیٹھنا کہیں ان سے کچھ کہہ دینا شراب کی حرمت ان کے سامنے بیان نہ کرنا یہ بڑے گستاخ ہیں۔ طرف ہونا محاورہ فارسی ہے اُردو میں متروک اور ناقابل استعمال ہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر فصیح الملک مرزا داغ مرحوم کا ہے۔ جسکے بتبدل مضمون کو شوخیٔ بیان نے چار چاند لگادئے ہیں۔

زاہد نہ چھیڑ ان کو مستانے آدمی ہیں
تجھکو لپٹ پڑینگے دیوانے آدمی ہیں

بیداد وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

بیداد وفا ملاحظہ کیجیے۔ یعنی اُس وفا نے جو تیرے عشق میں مجھے کرنی پڑتی ہی یہ ظلم ڈھایا ہے کہ اگرچہ میری جان کو لبوں سے بہت ربط اور محبت تھی یعنی وہ ہمیشہ ہونٹھوں پہ رہتی تھی مگر اسی بیداد وفا کی بدولت اُسنے لبوں کو چھوڑ دیا۔ اور گویا وہ ایسے شخص

جدا ہوئے جنمیں محبت تھی۔ اور دو دلوں کو جدا کرنا بڑا ظلم ہے اسی واسطے بیداد وفا کہا ہے۔

تا ہمکو شکایت کی بھی باقی نرہے جا
سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

معشوق کے انتہائے رنج، شوخی، اور سفاکی کا اسمیں نقشہ کھینچا ہے۔ کہ اگر کوئی ہمارا ذکر اوسکے سامنے چھیڑتا ہی تو وہ سن لیتا ہے کہ ہمکو موقع شکایت باقی نرہے۔ یا ہم اُس کے رنج کا اندازہ کرکے اوس سے معذرت چاہیں یا یہ شکایت کریں کہ آپکو ہمارے نام سے بھی نفرت ہے۔ اگرچہ ہمارا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ یہ ظلم اور بھی ظلم ہے کہ ہماری حالت سنکر بھی اُسکو رحم نہیں آتا اور وہ ہمارا کبھی ذکر نہیں کرتا۔

غالب ترا احوال سنادینگے ہم ان کو
وہ سُن کے بلالیں یہ اجارا نہیں کرتے

نہایت بلیغ شعر کہا ہے جسکے اتنے معنے پیدا ہوتے ہیں (کہ غالب) یعنی عاشق رد رہا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی میرا حال اُن کو سنادے اسپر کسی دوست کو ترس آتا ہے وہ حال سنانے کے لئے تیار ہوتا ہے اور معشوق کے پاس جانے کا قصد کرتا ہے تو یہاں گڑ گڑی پیدا ہوتی ہے اور جناب عاشق اپنے پیامبر دوست سے فرماتے ہیں کہ بہتر کوئی ایسی صورت بھی نکالنا کہ ایک گھڑی بھر کے لیئے وہ ہمکو اپنے پاس بلائے تو وہ دوست جھنجھلاتا۔ اور کہتا ہے کہ حال تو ہم اُنکو سنادینگے اسکے ذمہ دار نہیں ہوتے کہ وہ تمکو اپنے پاس بلا بھی لیں۔

دوسرا پہلو یہ نکلتا ہے کہ غالب بیہوش پڑا ہے۔ کوئی آتا ہے اور پکارتا ہے کہ اے غالب اُٹھ اُٹھ ترا احوال ہم اونکو سنادینگے۔ خیر یہ بھی یہ کام ہم سے ہو سکتا ہے کہ دینگے حال بلالینا یہ اون کا کام ہے ہم اسکا ذمہ نہیں کر سکتے۔ یا یہ کہ باتوں باتوں کسی نہ کسیطرح تیرا حال ہم اُن کو ضرور سنادینگے وہ سنکے بلائیں یا نہ بلائیں معشوق کے غرور اور عاشق کے شوق کا بھی اس شعر سے پورا پتہ چلتا ہے۔

دراصل شاعری اسی کا نام ہے جسمیں قلیل الفاظ میں معانی کثیرہ پائے جائیں۔ اور جس جس پہلو کو مصنف دکھانا چاہے وہ نہایت عمدگی کے ساتھ تصویر بنکر پڑھنے والے کے سامنے آجائے۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا   وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

میرے گھر میں رکھا ہی کیا تھا کہ تیرا غم اوسکو غارت کرتا۔ ایک حسرت تعمیر تھی وہ اب بھی موجود ہے اسے کمبخت عشق نے بھی غارت نہ کر دیا۔ اسی قسم کا ایک شعر گذر چکا ہے۔

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ   سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی   فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اول تو غم دنیا کیوجہ سے سر اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آتی اور اگر اتفاق سے فرصت بھی ہوتی ہے تو اودہر آسمان کو دیکھا ادہر تو مجھے یاد آیا۔ کیونکہ ظلم وستم کے وجہ سے تو آسمان سے مماثل اور اسکا ہمسر ہے اسی بہانہ سے غم کا سامنا ہو جاتا ہے لیعنی غم سے فرصت پاکر سر اٹھانا بھی میرے لئے باعث غم ہے۔

کھلے گا کسطرح مضموں مرے مکتوب کا یارب   قسم کھائی ہے اوس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

ایخدا میرے مکتوب شوق کا مضمون اسپر کیونکر ظاہر ہوگا کیونکہ اُس کافر نے تو قسم کھائی ہے کہ اب جو کاغذ بطریق خط میرے پاس آئیگا۔ یا ہر کاغذ کو میں جلا دوں گا تو یقیناً اب وہ میرے مکتوب سے باخبر نہیں ہو سکتا مولانا نظم وحسرت صاحبان نے اسکی شرح یہ فرمائی ہے کہ خط کے کھولنے کی تو اُس سے اُمید ہی نہیں اوسنے جلا ڈالنے کی بھی قسم کھائی ہے کاش کے جلاتا اور مکتوب سے شعلہ اٹھتا تو مضمون مکتوب یعنی حال سوز وگداز اسپر ظاہر ہوتا۔ یہ مطلب بھی پیدا ہوتا ہے غلط نہیں ہے۔ مگر ذرا بعید ہے۔ صاف وہی ہے جو ہم نے اوپر لکھا۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے   ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی

سوز غم دل میں چھپانا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے آدمی آگ پرنیاں لیعنی حریر میں لپیٹ سکتا ہے مگر سوز غم دل میں نہیں چھپا سکتا۔ بقول غالب۔

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا   جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

مضمون دونوں ایک ہیں مگر الفاظ کا لباس جدا جدا ہے۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا   اُٹھے تھے سیر گل کو دیکھنے شوخی بہانے کی

ارادہ یہ تھا کہ ذرا اپنے زخمیوں کو دیکھ آئیں مگر سیر گل کا بہانہ کیا۔ گویا گل اوسکے زخمی تھے اونکا تماشہ دیکھنے گیا تھا ذرا بہانے کی شوخی تو دیکھئے کہ اپنے زخمیوں کے دیکھنے کو پھول کی سیر سمجھتے ہیں۔ قریب قریب ایسا ہی مضمون ہے جو گذر چکا۔

ہوا ہے سیر گل آئینہ بیمہری قاتل   کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا   ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

ہم اپنی سادگی سے اس التفات ناز پر مر مٹے کہ تو یہاں تک آیا۔ لیعنی ہمکو دہوکہ ہوا کہ تو نے ہم پر مہربانی کی حالانکہ یہ بھی ایک تیرا ناز تھا۔ لیعنی ادہر آیا اودہر جانے کا قصد ہے گویا آنا جانے کی تمہید بن گیا۔ اور اس سبب سے یہ التفات ناز ہو گیا۔

لکدکوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی   میری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

مری طاقت سے اب حوادثات زمانہ بھی نہیں اُٹھ سکتے یا ایک وقت میں یہ ایسی قوی تھی کہ بتوں کے ناز اٹھانے کی ضامن تھی۔ گویا ناز بتاں لکدکوب حوادث سے زیادہ ہے۔ یا یہ کہ میری طاقت ضامن اس بات کی تھی کہ بتوں کے ناز اٹھائے آخر یہ اسکے ساتھ لکدکوب حوادث کا طوفان کیسا آیا۔ میری طاقت اس کا تحمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالب   بدی کی اُسنے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اہل جہاں کے اوضاع شریفانہ کی کیا خوبی بیان کروں جس سے بارہا ہم نے نیکی کی اونے ہمسے بدی کی۔ نیکی۔ اسمیں قافیہ معمولہ ہے۔ قواعد قافیہ میں معمولہ قافیہ کو عیوب میں سے سمجھا گیا ہے۔ مگر آجکل اسکو صنعت میں داخل کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ اب بھی شعر کو ویسا ہی سست کر دیتا ہے جیسا کہ پہلے کرتا تھا اور جسکی وجہ سے اسے عیوب میں داخل کیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ اول تو توافی ہی کی قید ہماری شاعری میں ایسی ہے کہ شاعر کو

کچھ سے کچھ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اسکے ساتھ جب صنعتوں وغیرہ کا التزام کیا جاتا ہے تو سر رشتہ معانی اور فصاحت و بلاغت سب غائب ہو جاتے ہیں اور شعر جسکی صفات میں سادگی جوش حقیقت اثر وغیرہ ہیں وہ بالکل رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہمیشہ احتراز لازم ہے۔ البتہ بے تکلفی کے ساتھ اگر کوئی صنعت آ جائے تو وہ حسن شعر ہے

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی — دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

آرزو خرامی سے مراد آرزو کا چکر لگانا۔ اور گشت کرنا ہے نہ یہ کہ جیسے مولانا نظم سمجھے ہیں کہ آرزو خرامی سے مراد خرام حسب آرزو مراد ہے۔ اور اسی بنا پر ترکیب کو اہمیات قرار دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے آرزو تو جو دل میں پھرتی ہے اور امید رکھتی ہے کہ جوش گریہ سے کچھ نفع حاصل ہوگا سو یہ بے خبر ہے اس سے ہاتھ دھو بیٹھ یعنی نا امید ہو جا۔ (جوش گریہ سے ہاتھ دھو بیٹھنا بے مثل ٹکڑا ہے۔ یعنی اس سے بس اتنا ہی فائدہ متصور ہے کہ تو ہاتھ دھو بیٹھے باقی کچھ نہیں) کیونکہ دل جوش گریہ میں ایک ڈوبی ہوئی آسامی ہے (ڈوبی ہوئی اسامی وہ جس سے لگان وغیرہ وصول ہونے کی امید نہو) یعنی اس سے تجھے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ڈوبی ہوئی اسامی بھی اس محل پر خوب صرف ہوا ہے۔

اسامی جمع ہے اسم کی چونکہ زمیندار اپنے کاغذات میں فہرست وار کاشتکاروں وغیرہ کا نام لکھتے ہیں اس صورت سے اسامی مستقل کاشتکاروں اور قرضداروں وغیرہ کے معانی کے لیے موضوع ہو گیا۔ اور یہ ایسا ہی لفظ ہے جیسے قارورہ جسکے اصل معنی شیشی کے ہیں چونکہ طبیبوں کو اسمیں رکھکر پیشاب دکھاتے ہیں اسواسطے اسکے مستقل معنے پیشاب کے مقرر ہو گئے۔ اس قسم کے ہزاروں الفاظ مل سکیں گے۔ فارسی میں اسی قسم کے محاورے بہت ہیں۔

اُس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھا دے — میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

جس شمع کو کسی نے بجھا دیا ہو اور وہ تمام ہو جلنے باقی ہو میں بھی ایسا ہی ہوں کہ پورے طریق سے جلنے نہ پایا تھا کہ مجھے بجھا دیا۔ اور میں اسی سے جلگیا ہوں۔ اسی مضمون کا یہ شعر ہے جو گذر چکا۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے — اے ناتمامی نفس شعلہ بار حیف

کیا تنگ ہم ستمزدگاں کا جہان ہے — جسمیں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہم غمزدوں ستم رسیدوں کا جہان اتنا تنگ ہے کہ ایک بیضہ مور اسمیں آسمان کی برابر ہے یعنی جہان میں ہمارے لئے کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ (ستمزدگاں) اچھا نہیں ہے۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

کائنات کی حرکت تیرے ذوق کی وجہ سے ہے۔ یعنی شوق میں تیری طرف دوڑ رہی ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے کہ آفتاب کے پرتو سے ذرہ میں جان پڑ جاتی ہے۔

حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ — غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے

میرا شیشہ پتھر کی چوٹ کھا کر لالہ رنگ ہو رہا ہے لیکن غافل کو یہ گمان ہے کہ اسمیں شراب سرخ بھری ہے۔

کی اُسنے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا — آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

وہ سینۂ اہل ہوس یعنی رقیبوں میں جا کر رہا ہے اوسے پسند کیوں نہ آئے وہ مکان ٹھنڈا ہے یعنی اونکے دلوں میں سوز عشق تو ہے نہیں۔ (جا گرم کرنا) فارسی کا ترجمہ ہے جو ٹھنڈے مکان کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ مگر کچھ اچھا نہیں ہے۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا — بس چپ رہو ہمارے بھی منھ میں زبان ہے

کیا آپنے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس رہنے دو خفا نہو ہمارے منھ میں بھی زبان ہے کچھ در منھ سے نکل جائیگا۔ ایسے مضمون کا ایک شعر انور دہلوی شاگرد مرزا غالب و ذوق مرحوم کا مجھے یاد ہے جو بہت ہی خوب ہے۔

شعر — نہ میں سمجھا نہ تم آئے کہیں سے — پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں　　فرمانروائے کشور ہندوستان ہے

جو سایۂ دیوار یار میں بیٹھا ہے وہ گویا ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ چونکہ ہندوستان بھی کالا ملک ہے اور سایہ بھی سیاہ ہے اسواسطے ہندوستان کی تخصیص بیجا نہیں ہے۔ اسمیں اعلان نون بعد اضافت کیا گیا ہے جو اب متروک ہے مگر غالب اور ذوق وغیرہ کے وقت تک جائز تھا اور اس قسم کے اشعار ان بزرگوں کے کلام میں اکثر مل سکتے ہیں۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا　　کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

میرے جگر کو داغ غم نے ایسا کھا لیا۔ کہ اب اگر کسی سے یہ کہوں کہ میرا داغ جگر کا نشان ہے تو کسکو میرے اس کہنے کا یقین نہیں آسکتا۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ اسکے جسم میں پہلے جگر تھا بلکہ سب جھوٹ سمجھیں گے کسیکا شعر ہے

ہوتا جو دل تو تمکو دکھاتا میں داغ دل　　اب کیسا دکھاؤں اب تو نہ دل ہے نہ داغ ہے

ہے بارے اعتماد وفاداری اسقدر　　غالب ہم اسمیں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

ہم اس سے خوش ہیں کہ وہ ہمپر نامہربان ہے کیونکہ ہم اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمپر اسکو وفاداری کا اعتماد ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہم کیسے ہی نامہربان ہوں لیکن وہ وفا کو ترک نہ کرے گا۔ یا یہ کہ اسکے عہد بیوفائی کے ایفا سے ہم خوش ہیں۔

درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اے ظالم میرے درد سے تجھکو بیقراری ہے ہائے تیری غفلت شعاری کیا ہو گئی کہ میں مرتا اور غم کرتا تھا تجھے اوسکی پروا بھی نہ ہوتی تھی۔ یہ غزل تمام اپنی معشوقہ کے غم کے مرثیہ میں کہی ہے یا کسی دوسرے کو اوسکے معشوق کا مرثیہ لکھکر دیا گیا ہے۔ مگر جیسے درد کے شعر ہیں ان سے صاف صاف یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ سب آپ بیتی ہے دوسرے کے لئے ایسے درد انگیز اشعار نکلنا محال ہیں۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ　　تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

اگر تو مجھے رنجیدہ دیکھکر برداشت نہ کر سکتا تھا تو تو نے میری غمگساری کا کیوں دم بھرا تھا مجھسے بیخبر رہنا تیرے لئے اچھا تھا۔

کیوں مری غمخوارگی کا تجھکو آیا تھا خیال　　دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

تو نے میری غمخواری کا ارادہ کیا تھا۔ مگر میرے درد کی تو تاب نہ لا سکا اور آخر اپنی جان کھو دینی پڑی گویا میرے ساتھ دوستی کرنا اپنے ساتھ دشمنی تھی۔

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا　　عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

اگرچہ تو نے میرے ساتھ عمر بھر کے لیئے وفا کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ مگر کیا فائدہ ہوا کم بخت عمر بھی تو نا پائدار ہے آخر اُسنے دغا دی۔ تو خود مجھسے جدا نہوا تو اُسنے جدا کر دیا۔

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی　　یعنی تجھسے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

مجھے زندگی کی آب و ہوا زہر معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسکی تجھسے موافقت نہ تھی۔ لہذا جو نکہ وہ تیری دشمن تھی میں بھی اوسکا دشمن ہوں اور وہ مجھے بری معلوم ہوتی ہے۔ حاصل یہ کہ تیرے مرنیکی وجہ سے اب میرا بھی جینے سے دل بیزار ہے۔

گلفشانیہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا　　خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

کبھی تیرا جلوہ گلفشانی کیا کرتا تھا۔ اور آج یہ وقت ہے کہ تیری قبر پر لالہ کاری ہو رہی ہے اور پھول پڑے ہائے جا رہے ہیں۔ ہائے تیری گلفشانی جلوہ کو کیا ہو گیا۔

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں　　ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

تجھے عشق کی رسوائی پسند نہ آئی اور اس شرم سے نقاب خاک میں جا چھپا۔ الفت و محبت کی پردہ داری تو نے ختم کر دی۔ اس سے زیادہ کوئی رسوائی عشق کو کیا چھپائیگا۔

حکیم مومن خاں مرحوم نے بھی اپنی معشوقہ کے مرثیہ میں پردہ کا ایک شعر کہا ہے جو حد سے زیادہ درد میں ڈوبا ہوا ہے۔

۵ بے پردہ جبکو صحن میں دیکھا نہ تھا کبھی — لاش اوسکی جائے ہے سر بازار ہائے ہائے

خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی — اٹھ گئی دنیا سے رسم و راہ یاری ہائے ہائے

ترے پیمان محبت کو تو نے خاک میں ملا دیا۔ دنیا سے راہ و رسم محبت اٹھ گئی تو نے مجھ سے بیوفائی کی گویا اس شعر میں شکایت کر رہے ہیں مگر اس سے درد مترشح ہوتا ہے اور یہ ایک بین ہے۔

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا — دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

میرے دلبر ابھی تیغ محبت نے گہرا زخم نہ کیا تھا کہ تیغ زن کا ہاتھ ہی بیکار ہو گیا۔

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تار برشگال — ہے نظر خو کردہ اختر شماری ہائے ہائے

میری آنکھوں کو عادت پڑی ہوئی ہے کہ میں رات کو تیرے انتظار میں تارے گن گن کر تمام کروں مگر اب یہ برسات کی اندھیری راتیں ہیں کیونکر کٹیں گی کہ نہ تارے ہونگے نہ تیرے ملنے کی امید ہوگی رخصت برشگال میں وصل معشوق زیادہ لطف دیتا ہے شعرا کے یہاں ایسے مضمون بہت ملتے ہیں۔ اسی مضمون کا داغ مرحوم کے یہاں ایک شعر ہے

شب تاریک میں گھنگھور گھٹا چھائی ہے — کاش گنتے جو نمودار ستارے ہوتے

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال — ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

ہمارے کان کو کوئی مژدہ پیام سننے کو نہ ملتا ہے اور نہ آنکھ کو جمال یار دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہائے ہائے ہمارے پہلو میں ایک دل ہے اور اسپر یہ ناامیدواری ہے۔

مولانا نظم صاحب لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کے شعرا میں آتش و ناسخ وغیرہ اور دلی میں ذوق و مومن وغیرہ مصنف کے زمانہ سے کسی قدر پیشتر ہی ہیں۔ تس پر کسی کے کلام میں نہیں ہے نہ لکھنؤ نہ دلی میں عرصہ سے یہ لفظ بولا جاتا ہے مصنف کے قلم سے اس لفظ کا نکلنا نہایت

حیرت ہے۔ اور یہ لفظ اسبات کا شاہد ہے کہ مرزا نوشہ مرحوم کی زبان دلی کی زبان سے کسی قدر علیحدہ ہے۔ انتہے۔

میں کہتا ہوں۔ کہ یہ لفظ آجتک دہلی کے روزمرہ میں داخل ہے۔ مجھے یہ یاد ہے کہ مومن خاں کے یہاں میں نے یہ لفظ کئی جگہ دیکھا ہے اور غالباً ناسخ کے یہاں بھی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مجھے شعر یاد نہیں ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسکا استعمال عام ہے مثال کے لئے میں دو ایک شعر لکھتا ہوں۔

دل بھلا ایسے کو ای درد نہ دیجئے کیونکر — ایک تو یار ہے اور تس پہ طرحدار بھی ہے
مجروح ہے سب سینہ تس پر ہے نمک پاشی — آنکھوں کے لڑانے کا ہم خوب مزا دیکھا
طاقت نہیں ہے جان میں کڑھنا غضب ہے اور — بے لطفیاں کرو ہو یہ تس پر غضب ہے اور

راجہ جسونت سنگھ مرحوم معروف بہ کاکا جی ابن مہاراجہ بینی بہادر نائب نواب شجاع الدولہ شاگرد لالہ سروپ سنگھ دیوانہ۔

بحر ہستی میں ترا جسم ہے مانند حباب — تس پہ اکڑم کی ہوا کھانے پہ سر زور ہے تو
اے دل آزار تو ہی کر انصاف — ہے یہی طرز دلربائی کی
عہد کیا کیا تھے اور قول و قرار — آہ تس پر بھی بے وفائی کی

لیجئے ناسخ کی ایک رباعی یاد آئی اسمیں تسپر بندھا ہوا ہے۔

۵ ہر چند ہوں پیر اور سر پر ہے اجل — تس پر نہیں پیٹ کے سوا فکر عمل
ہے رشتہ عمر مختصر سا لیکن — شیطاں کی آنت ہے مرا طول امل

نظیر اور میر درد کے یہاں بھی بہت ہے میر حسن کے یہاں بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ مولانا نے اپنی شرح میں صرف اپنی معلومات سے کام لیا ہے تحقیق کو دخل نہیں دیا۔ ایک جگہ مرزا غالب مرحوم نے غلطی لکھا ہے اسے بھی غالباً غلط بتایا ہے۔ اوّل تو غلط کہا ہے پھر یہ کہکر ٹال گئے ہیں کہ ہندیوں کا تصرف ہے۔ فرماتے ہیں کہ قدیم اردو میں بھی یہی نہیں برتا گئی تھی۔ اور اسپر میر تقی مرحوم کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

غلط اپنا کہ اس جفا جو کو — سادگی سے ہم آشنا سمجھے

مگر یہ خیال نہیں فرمایا کہ میر صاحب یوں بھی فرماتے ہیں

۵ سب غلطی رہی بازی طفلانہ کی یکسو — وہ یاد فراموش تھے ہمکو نہ کیا یاد

یا یوں سمجھئے کہ غالب اساتذہ مسلم سے ہیں۔ اگر بھول کر ایک جگہ غلطی ہوگئی تھی تو دوسری جگہ ٹھیک ہوتی۔ ایک اور فرماتے ہیں۔

دل دیا جان کے کیوں اسکو وفادار اسد غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

میرے عشق نے ابھی وحشت کا رنگ نہ اختیار کیا تھا کہ معشوق نے جان دیدی۔ مجھے جو اُسکے عشق میں ذلت وغیرہ کی خواہش تھی وہ دل ہی میں رہ گئی۔

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

مجھے اپنی سرگشتگی میں اپنی زندگی سے ناامیدی ہوگئی ہے لہذا میری تسکیں کو نوید دینی چاہئے کہ تیری خوشحالی کا زمانہ قریب ہے۔ مجھے اپنے مرجانے کی اُمید ہے۔ یعنی میں وہ دیوانہ ہوں کہ مر کر مجھے تسکیں ہوگی۔

لیتا نہیں میرے دل آوارہ کی خبر اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

اب تک سے یہ معنے پیدا ہوتے ہیں کہ میرا دل مٹ گیا تباہ ہوگیا۔ اور وہ اُسکی اس خیال خبر نہیں لیتا کہ میرا دل ابھی تک میرے پاس ہے۔

کیجے بیاں سرور تپ غم کہاں تلک ہر مو مرے بدن پہ زبان سپاس ہے

اپنے تپ غم کا سرور کیا بیان کروں کہ اس کی وجہ سے میرا ہر ایک موئے تن زبان سپاس بن گیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب تپ چڑھتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسکو زبان سپاس کہا گیا ہے۔ تلک اب متروک ہے۔ اگرچہ بقول مولانا نظم بلا وجہ ہے۔ کیونکہ یہ تلک اور تئیں کے بعد پیدا ہوا۔ اب بجائے تلک کے تک صحیح ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ زبان کے دائرہ کو بلا وجہ تنگ کرتے جاتے ہیں اول تو خیال کیا جائے کہ اردو زبان خود ہی ایسی تنگ ہے کہ جو مضامین دوسری زبانوں میں چار چار سطر میں ادا ہو جاتے ہیں اسکے لیے چار چار صفحے رنگنے پڑتے ہیں مگر پھر بھی جلیں نہیں ہے۔

ہے وہ غرور حسن سے بیگانۂ وفا ہر چند اُس کے پاس دل حق شناس ہے

وہ جو میری قدر نہیں کرتا اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ ناحق پسند اور جفا کیش ہے نہیں بلکہ پاس دل حق شناس ضرور ہے مگر غرور حسن اسکو اسطرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں

پی جسقدر ملے شب مہتاب میں شراب اس بلغمی مزاج کو سردی ہی راس ہے

جسقدر شب مہتاب میں شراب ملے پی۔ کیونکہ شب مہتاب کا مزاج بلحاظ سردی۔ یا بہ لحاظ رنگ۔ یا بوجہ مرطوب ہونے کے بلغمی ہے۔ اور بلغم میں گرم دوائیں دیجاتی ہیں کیونکہ اکثر حکماء علاج بالضد کرتے ہیں۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

ہر ایک مکان کی رونق مکیں سے ہوتی ہے مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل ویران معلوم ہوتا ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ بے وقوف ہیں ان کو خاموش رہنا مناسب ہے تاکہ اُن کے راز کسی پہ کھلیں اگر یہ واقعی ہے تو میں بہت خوش ہوں کہ مجھے ہر وقت خاموش بیٹھے رہنے کی عادت ہوگئی ہے میرا راز کوئی نہ سمجھ سکیگا۔ مگر یہ خیال غلط ہے میری خاموشی ایسی ہے جو میرے لیے اور اُنکی غماز سب سے زیادہ ثابت ہوگی۔

دوسرا پہلو اسمیں یہ بھی ہے کہ خاموش رہنے کا صرف اک یہ فائدہ ہے کہ کوئی راز دل پر وقوف نہیں پاسکتا ہے مگر میں خوش ہوں کہ میں وہ مجذوب ہوں کہ اگر میں خاموشی سے بھی کام نہ لوں تب بھی کوئی میری بے تکی بڑ کو سمجھ نہیں سکتا ہے۔ یعنی یہاں بغیر خاموشی ہی فوائد خاموشی حاصل ہیں۔

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلا دل فرد جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

میں اپنی حسرت اظہار کا کس کے سامنے گلا کروں بس میرا دل ہی اس کو خوب جانتا ہے کہ کسقدر مجھے حسرت دل کا اظہار کرنا چاہیئے تھا اور زبان سے کسقدر اظہار ہو سکا۔ گویا میرا دل ایک جمع اور خرچ کی فرد ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسقدر حسرت اظہار اسمیں جمع ہے وہ زبان کے ذریعہ سے کچھ بھی خرچ نہیں ہو سکی ایک جگہ ایسے ہی مضمون کا ان الفاظ میں اظہار کر چکے ہیں۔

ے نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدار حسرت دل ہے
میری نظر میں ہے سب جمع و خرچ دریا کا

کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

اس شعر میں آئینہ پرداز کے معنے غالباً جلوہ گر ہونے کے لئے ہیں یعنی الحذر از رحمت جو لب بے سوال کی طرف سے عذر خواہی کرتی ہے وہ کس پردہ میں حیران اور سرگشتہ جلوہ گر ہو رہی ہے۔ میں لب بے سوال رکھتا ہوں میری وہ عذر خواہی کیوں نہیں کرتی۔ اور مجھ پر رحم کیوں نہیں ہوتا۔

جناب نظم صاحب کی شرح کا مطلب اگرچہ میں نہیں سمجھا۔ مگر لکھے دیتا ہوں خدا جانے کیا فرمایا ہے ممکن ہے کہ ناظرین سمجھیں لب بے سوال کا بے نفس ہونا ضرور ہے اور لب کو بے نفس و بے سوال اس مناسبت سے کہا ہے کہ نفس کے پہونچنے سے آئینہ مکدر ہو جاتا ہے۔ تو ضرور ہوا کہ آئینہ پرداز سے ملنے کی خواہش لب بے سوال سے کرنا چاہیئے اور آئینہ پرداز وہ جو آئینہ کو جلا کرے رحمت کا فعل محذوف ہے یعنی رحم کر۔

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

اے شوق تو یہ خیال کرتا ہے کہ ہم نے دشمن کو دوست سمجھکر ادسے اپنا دل دیدیا یہ تیرا خیال غلط ہے وہ ہمارا دشمن نہیں ہے بھلا وہ اور دشمنی خدا نکرے یہ تیرا خیال اس قابل ہے کہ تو اسپر شرمندہ ہو۔ یا یہ کہ اے شوق تو جو شرمندہ ہے کہ ہم نے دشمن کو دوست سمجھنے میں غلطی کی یہ تیری شرمندگی خلاف اور بیجا ہے وہ دشمن نہیں ہے فی الحقیقت دوست ہے بھلا وہ اور دشمنی کا شیوہ اختیار کرے گا۔ ایک جگہ فرما چکے ہیں۔

ے ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
میں اور خدا نکردہ تجھے بیوفا کہوں

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

چونکہ حضرت علی وہاں پیدا ہوئے یا وہاں تھے محض اسکی وجہ سے لباس کعبہ مشکیں ہے ایہام کیا ہے یعنی لباس کعبہ خوشبودار ہے حالانکہ لباس سیاہ ہے۔ لہذا اُسی سیاہ کو مشکیں کہہ کر خوشبودار کے معنی نکالے اور پھر نتیجہ مرتب کیا کہ اسکا مشکیں ہونا کچھ اسوجہ سے نہیں ہے کہ اسکو ناف زمین کہا گیا ہے۔ ناف غزال خوشبودار ہوتی ہے اور مشک وہاں سے نکلتا ہے نہ کہ ناف زمین سے۔ یا مشکیں سے مراد دونوں جگہ سیاہ لیجئے مگر محض سیاہی میں کچھ قدم حضرت علی کرم اللہ وجہ کی تعریف نہیں نکلتی۔ یہ مضمون غالباً مصنف ہی کا ہے ایک جگہ فارسی میں بھی فرماتے ہیں۔

ے از کرتش ناف زمیں ناف غزال است
مشکین زچہ شد ورنہ لباس حرم آیا

وحشت پہ میرے عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرق انفعال ہے

میری صحرا نوردی کے موافق چونکہ زمین پر میدان اور جنگل نہ تھے اور یہ اتنی وسیع نہ تھی تو زمین کو شرمندگی ہوئی اور پسینہ آیا۔ یہ دریا نہیں ہیں جو تم دیکھتے ہو بلکہ یہ اُسکا پسینہ ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

عالم دنیا محض ایک دھوکے کی ٹٹی یعنی حلقۂ دام خیال ہے اسکے فریب میں نہ آنا۔ یعنی ہستی ایک خیالی جال ہے اور اسی میں ایک عالم پھنسا ہوا ہے ورنہ دراصل ہستی کوئی چیز نہیں ہے۔ مت متروک آجائیو غیر فصیح آنا صحیح۔ اسی مضمون کا یہ شعر ہے

ے ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

تم اپنے شکوہ کی باتیں کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اسمیں آگ دبی ہے

آخر تم اُن شکووں کو جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں کھود کھود کر کیوں پوچھتے ہو مناسب یہی ہے کہ اس ذکر کو چھوڑ دو کیونکہ جن کو تم شکوہ سمجھے ہو وہ دراصل شکوہ نہیں ہیں بلکہ آگ ہے۔ ممکن ہے کہ بھڑک اُٹھے اور فتنہ و فساد کو اشتعال ہو۔

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر — نہ گریۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

اے دل اس درد و الم سے گھبرانا فضول ہے کیونکہ آخر کو یہ تمام دردوں سے نجات دہندہ ثابت ہوگا یہ ظاہر ہے کہ اگر اسی صورت سے یہ درد و الم کچھ دنوں رہا تو ہمارا کام تمام کر دے گا اور کام تمام ہوا تو یہ آہ نیم شبی اور گریۂ سحری سب غائب ہو جائینگے۔

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا — ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

تیرے کاغذ پر وفا گویا ایک حرف غلط تھا۔ جو صرف ایک جگہ لکھا تھا سو خود بخود مٹ گیا

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں — ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے

ظاہر تو اسکا یہ مطلب ہے کہ ہمارا دل ذوق فنا کی ناتمامی اور ناکامی پر کیونکر نہ جلے باوجودیکہ ہماری آہ اسقدر آتشبار ہے مگر پھر بھی ہم جل نہیں جاتے۔
دوسرا مفہوم وہی طلب کا مسئلہ ہے جسکو مصنف پانچ چار جگہ نظم کر چکا ہے۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے — اے ناتمامی نفس شعلہ بار حیف

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

جب آگ کو پانی سے بجھاتے ہیں تو اس سے بھی آواز نکلتی ہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ عاجزی کے وقت ہر کسی کے منھ سے فریاد نکل جاتی ہے۔

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

جسکے جلوہ سے زمین سے لیکر آسمان تک کائنات کا ایک ایک ذرہ سرشار اور بدمست ہو رہا ہے وہ اس بدمستی کا خود ہی عذر خواہ ہے کہ میرا جمال اور حسن ایسا ہے جس سے ہر کوئی بدمست اور سرشار ہونا چاہیے۔

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی — زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

مجھ سے یہ نہ کہہ کہ تو ہمکو اپنی زندگی کہا کرتا تھا خیر یہ بھی سہی کہ تیری جدائی کے سبب یا دنیا کے انکار کی وجہ سے آجکل میرا دل زندگی سے بھی بیزار ہے۔ گویا معشوق ان کو مار رہا ہے۔ بہت خوب شعر کہا ہے۔

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا — تجھ پہ کھلجائے کہ مجھکو حسرتِ دیدار ہے

میں نے عنوان نامہ یا سرنامہ پر اپنی آنکھ کی تصویر اسواسطے کھینچدی ہے کہ کم از کم تجھے یہ معلوم ہو جائے کہ مجھے دیدار کی حسرت ہے۔ ذوق

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر — آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچہ سے میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

میرے کوچہ سے انہیں ایسی نفرت ہے کہ جب پالکی میں سوار ادھر سے گذرتے ہیں تو اگر کہار کندھا بدلنا چاہتے ہیں تو بدلنے نہیں دیتے کہ یہاں اتنی دیر بھی نہ ٹھہرنا چاہیے۔ یا یہاں ظلم و ستم معشوق مراد ہے کہ ایسا ظالم ہے کہ میں دیکھتا ہوں جب وہ میری گلی سے گذرتا ہے تو کہاروں کو کندھا بھی نہیں بدلنے دیتا۔ لفظ فنس۔ اور پنیس دونوں صحیح ہیں اسیطرح کاندھا اور کندھا دونوں درست۔ بعض آدمی کہتے ہیں کہ یہ ایک رکیک مضمون ہے۔ مگر اسکی رکاکت ہمیں معلوم نہیں کہ اُسپر کچھ لکھیں۔ افسوس ہے کہ گالیاں کھانے کے مضمون رکیک نہیں ٹھہرائے جاتے اور جو مضامین واقعتاً نزیہے اور صحیح ہیں انکو رکاکت سے متہم کیا جاتا ہے یا للعجب

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے — جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

میری ہستی ہستی نہیں حیرت آباد کی ایک فضا ہے۔ جسمیں نام نالہ مثل عنقا موجود ضرور ہے مگر نالہ کا کہیں پتہ نہیں ہے یہ ظاہر ہے کہ حالت حیرانی میں انسان نہ نالہ کر سکتا ہے نہ فریاد کر سکتا ہے۔ یعنی میں سراسر حیران ہوں نالہ وغیرہ کچھ نہیں کر سکتا کمال حیرانی سے مجھ میں نالے کا نام باقی ہے مگر اوسکا وجود نہیں ہے۔

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کسکو کوئی موسم ہو — وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ہم خزاں اور بہار سے کچھ مطلب ہی نہیں رکھتے کوئی موسم ہو ہمیں بال و پر کے ماتم کے سوائے اور کوئی کام نہیں ہے۔ اس شعر کی بندش نہایت چست ہے۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم ‖ اثر فریاد دلہائے حزیں کا کسنے دیکھا ہے

معشوقوں کی وفا اتفاقی ہے ورنہ جذب وفا میں یہ تاثیر نہیں کہ وہ کسی کو مہربان کرے یا آہ و فریاد سے یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ معشوق اُس کو سنکر وفا کریں - یہ ایک امر اتفاقی ہے۔

ﮯ آہ کا کسنے اثر دیکھا ہے ‖ ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

نہ لائی شوخی اندیشہ تاب رنج نومیدی ‖ کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے

میری شوخی اندیشہ سے رنج یاس دنا میری اُٹھ نہ سکا - حالانکہ یہ مایوس ہو چکی ہے اور یہی خیال ہے یہ ہاتھ مل رہی ہے مگر اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ از راہ تجدید بیعت تمنا اسکا یہ فعل ہے اور نکتہ اسمیں یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز کے فوت ہونے کا افسوس کر کے ہاتھ ملتا ہے تو گویا وہ از سر نو تمنا کرتا ہے کہ ہائے ایسا ہو جاتا تو کیا اچھا ہوتا - آہ ایسا کیوں نہ ہوا -

رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے ‖ نبض بیمار وفا دود چراغ کشتہ ہے

اے ظالم عاشق بیمار پر اب بھی تو ستم کرتا ہے اب وہ قابل رحم ہے اوسکی ہستی اب کوئی ہستی نہیں ہے جس سے اسقدر بغض رکھا جائے - بیمار وفا کی نبض چراغ کشتہ کا دھواں ہے کہ وہ بتدریج کم - اور سرد اور کمزور ہوتا جاتا ہے اسی صورت سے آخری وقت کی نبض ہوتی ہے آخری وقت نبض کی جو حالت ہوتی ہے اُسے حکما نے یوں لکھا ہے - ہو فی غایۃ الصغر والتواتر دیکھنے عن کمال سقوط القوۃ و قرب الموت ۵ مولانا نظم نے اس آخری نبض کو دودی لکھدیا ہے دودی کمزور ضرور کرتی ہے مگر وہ بالکل قوت کو ساقط نہیں کرتی -
اسکی تعریف یہ ہے صورتہ کالموجی فی الشھوق الا انہ لیس بعریض ولا ممتلی -
ویدل علی سقوط القوۃ لکن لا تماماً ۵ مصنف کی تشبیہ یقیناً نمل سے زیادہ بدیع ہے ۔

ﮯ از نالہ مرغ کہ آخر رسید کار ‖ شمع خموشم و زسرم دود می رود

دل لگی کی آرزو بیچین رکھتی ہے ہمیں ‖ ورنہ یاں بیرونقی سود چراغ کشتہ ہے

کیا کریں ہم کو دل لگی کی آرزو مجبور کرتی ہے ورنہ چراغ کی بیرونقی سے جیسے کہ اُسکو فائدہ پہونچتا ہے ایسے ہی عشق ترک کرنے سے ہمکو بھی فائدہ پہونچے گا -
غرض یہ کہ دل لگی کی آرزو ہی ہماری تباہی کا پیش خیمہ ہے اگر ہم اسے چھوڑ سکیں تو نفع میں رہیں -

اگرچہ بظاہر یہ زمین بڑی ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے مگر ہم نے دیکھا ہے کہ غالب نے مشکل سے مشکل زمین بھی ایسی اختیار کی ہے کہ جسمیں اگر فکر کی جائے تو ہر شخص کچھ نہ کچھ اچھے شعر نکال لیگا اس سے غالب کے مذاق سلیم کا اندازہ ہوتا ہے - بخلاف دیگر حضرات کے کہ اونکی نکالی ہوئی سنگلاخ زمینیں گویا کہ انہیں کے واسطے تھیں - باقی ہیچ -
بعض آدمیوں کا خیال ہوتا ہے کہ ہمیشہ سخت ترین زمینوں میں غزل لکھیں - مگر یاد رہے کہ وہ ہمیشہ اپنی طبیعت کو خراب کرتے ہیں - یہ ظاہر ہے کہ مشکل زمینوں میں غزل لکھنے میں قافیہ پیمائی کے سوائے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوتا وہاں تو یہ فکر ہوتی ہے کہ مضمون کو کسی صورت سے اس قافیہ کے ساتھ گانٹھ دیا جائے باقی معانی کے لحاظ سے سوا آورد کے آمد کا کہیں نام نہیں ہوتا - اور یہ ضرور ہے کہ آورد میں معانی آفرینی کسیقدر کر لیجے مگر سادگی - اصلیت - جوش - اثر وغیرہ سے شعر بالکل علیحدہ رہتا ہے اور یہ شاعری ایسی ہے جیسے تیلی کا بیل رات بھر چلنے کے بعد بھی صبح کو اپنی ہی جگہ پر ملتا ہے -

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے ‖ سرمہ تو کہوے کہ دود شعلہ آواز ہے

معشوقوں کی آنکھ اگرچہ خاموش ہے - مگر اس خاموشی میں بھی وہ سخنگوئی کرتی ہے اس پر یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ جو لوگ سرمہ کھا جاتے ہیں اونکی آواز نہیں نکلتی اور بستہ ہو جاتی ہے پھر آنکھ کہ جسمیں سرمہ موجود ہے اُسکو آپ سخنگو کیونکر کہہ سکتے ہیں - تو گویا دوسرا مصرعہ اس کا جواب ہے - کہ سرمہ سرمہ نہیں ہے اوس شمع رو کی آواز مثل ایک شعلہ کے ہے اور یہ مسلم ہے کہ شعلہ سے دھواں اٹھتا ہے تو یہ سرمہ اُس شعلہ کا جما ہوا دھواں ہے

توکہے۔ تو کوئی کا ترجمہ ہے

پیکر عشاق ساز طالع ناساز ہے ۔ نالہ گویا گردش سیارہ کی آواز ہے

عشاق کے جسم گویا طالع ناساز کے لئے ساز ہیں اور نالہ اوسکے گردش ستارہ کی آواز ہے۔ حاصل یہ کہ عشاق طالع ناساز کے ہاتھ میں گویا ایک باجہ ہیں جس سے نالہ فریاد کی آواز نکلتی ہے۔ عشاق بھی فارسی میں ایک باجے کا نام ہے جیسے سعدی فرماتے ہیں

؎ در نالہ عشاق ونہاوند وحجاز است ۔ الخ سیارہ سے مراد ستارہ بدقسمتی ہے

دستگاہ دیدۂ خونبار مجنوں دیکھنا ۔ یک بیابان جلوۂ گل فرش پا انداز ہے

ذرا مجنوں کی چشم خونبار کی قدرت دیکھئے کہ تمام بیابان کو اوسکی آنکھ کے خونی آنسوؤں نے گلزمیں بنا دیا ہے اور اس صورت سے گویا مجنوں کے قدموں کے نیچے ایک پھولوں کا فرش بچھا دیا ہے۔

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی ۔ میری وحشت تری شہرت ہی سہی

اسمیں سہی یہ معنی پیدا کرتا ہے کہ تو میرے عشق ومحبت کو وحشت کہتا ہے اچھا میں بھی مانتا ہوں عشق نہ سہی وحشت ہی سہی۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ میری وحشت سے تیری شہرت ہوتی ہے۔ نواب مصطفے خاں شیفتہ مرحوم یوں فرماتے ہیں

؎ عشق ذلت ہے تو ذلت ہی سہی ۔ میری ذلت تری عزت ہی سہی

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے ۔ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم سے قطع تعلق نہ کیجئے اگر محبت نہیں کرتے تو عداوت ہی کیجئے۔ اس مضمون کو مصنف نے بہت جگہ لکھا ہے۔ جیسے کہ ؎

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو ۔ کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ۔ اسقدر دشمن ارباب وفا ہوجانا

شیفتہ مرحوم اسی مضمون کو یوں باندھتے ہیں۔

خاک ہونے پہ مرے دمیان تو ہے ۔ نہ سہی لطف کدورت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی ۔ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

اے کا لفظ یہاں بطریق ندا نہیں ہے بلکہ ایک محاورہ ہے۔ مگر یہ محاورہ اکثر عورتوں میں مستعمل ہے مطلب یہ ہے۔ کہ آپ کہتے ہیں کہ تو ہمارے یہاں نہ آیا کر کوئی ہم مجلس تو کرتے نہیں ہیں اسیکا یہ جواب دیتا ہے۔ کہ ارے صاحب وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی مگر میں ہوں گا تو آپ کی کیا رسوائی ہوجائے گی۔

؎ ہمیں در سے اٹھا دینے کی آخر وجہ بھی کوئی ۔ یہاں بیٹھے ہیں تو کچھ آپ کا نقصان کرتے ہیں

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ۔ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اسکے معنے مولانا نظم اور حسرت صاحب نے یہ لکھے ہیں۔ کہ کوئی ہم اپنے دشمن تھوڑی ہی ہیں کہ اس بات کا یقین کر کے کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے پھر بھی تجھسے محبت کئے جائیں اور رشک رقابت میں جان دیں مگر غور کیا جائے۔ تو لفظ۔ بھی۔ اور سہی۔ اس بات کے شاہد ہیں کہ مصنف یہ نہیں کہنا چاہتا جو کچھ سمجھا گیا بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے تو سہی ہم بھی جانتے ہیں۔ مگر ہم بھی تو دشمن نہیں ہیں ہم بھی تو اپنے ہی ہیں۔ ہمکو بھی تجھ سے محبت ہے، پھر ہمکو اوسکے مقابلہ پر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے۔

شیفتہ مرحوم نے الفت کا قافیہ خوب کہا ہے

؎ میرے آزار کی ہمت ہی سہی ۔ تمکو الفت ہے تو الفت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ۔ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

یعنی جو کچھ حاصل کیجئے اپنی ذات سے حاصل کیجئے دوسرے کی منت پذیری بہت بری ہے۔ اسمیں ایک پہلو تصوف کا یہ بھی نکلتا ہے۔ کہ جو کچھ حاصل کرو اپنی ہستی اپنی ذات سے حاصل کرو۔ چاہے وہ غفلت ہی کیوں نہو اور جب اپنی ذات سے غفلت حاصل کی تو یہ عین آگاہی ہے

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام   دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

اگرچہ عمر بہت جلد گذر جاتی ہے تو اتنی فرصت تو ہے کہ اپنے دل کو خون کر ڈالیں۔ برق بھی گویا ابر کا خون شدہ دل ہے۔ یہ شعر بھی خوب ہے۔

شیفتہ زدہ جام غم در تنگ حرماں   پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی

اگرچہ یہ شعر بھی بہت خوب ہے مگر غالب کے یہاں نیا مضمون ہے۔ اور شیفتہ مرحوم نے ایک خوبی کے ساتھ پرانے پامال مضمون کو باندھا ہے۔

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں   نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کیا یہ سمجھ کر عشق سراسر مصیبت ہے۔ یا عشق میں سب ہی مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے ہم وفا ترک کر دیں گے ایسا نہیں ہو سکتا۔

ؔ موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے   آستان یار سے اُٹھ جائیں کیا

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف   آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

اے آسمان نا انصاف مجھے کچھ تو دے۔ اگر میری مراد نہیں دیتا تو آہ و فریاد کی اجازت تو دے تو نے وہ کیا ہے کہ ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے   گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ایک جگہ یوں کہہ چکے ہیں ؎

دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی   ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیئے

اس شعر میں حسرت و ارزو کا خاکہ کھینچا گیا ہے اور اگرچہ اسمیں لفظ رخصت استعمال کیا گیا ہے جو اردو میں بجائے اجازت کم مستعمل ہے مگر اس شعر میں نہایت لطیف ہے۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

ابھی تو ہم یہ سمجھے تھے کہ تو بے نیاز ہے اور عجز و نیاز وغیرہ سے کچھ کام نہیں چلتا۔ اب معلوم ہوا کہ بے نیازی تیری عادت ہے لہذا اب ہم بھی تسلیم و رضا کی عادت ڈالیں گے کہ تیری بے نیازی کو بخوشی خاطر برداشت کر سکیں۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ   گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

یار سے کچھ نہ کچھ چھیڑ چلی جائے کچھ نہیں تو اظہار حسرت و ارمان کی حسرت ہی سہی اس سے یہ لطیف معنے بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ہم جو اسکو حال سنانے کے لئے مجبور کرتے ہیں تو وہ اسکو چھیڑ سمجھتا ہے۔ اچھا خیر یہ چھیڑ جاری رہنی چاہیئے۔

مومن ہاں جوش تپش چھیڑ چلی جا کہ پر تو   چھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

اس زمین میں نواب مصطفے خاں شیفتہ کا مقطع اور کئی شعر قابل داد ہیں۔ تفریح طبع ناظرین کے لئے لکھنے پر مجبور ہوں۔

نہ لکھو نامہ نہ بھیجو پیغام   عشق کی آپ سے نسبت ہی سہی
دیکھنا غیر کا موقوف تو ہے   قتل کی میرے ندامت ہی سہی
سب فسانہ کا نہیں ہے جو دماغ   ایک چھوٹی سی حکایت ہی سہی
ناشکیبی کی دعا مانگیں گے   صبر کی ہمکو ضرورت ہی سہی
ہجر تو جائے جو ہو جائے وصال   وصل ممکن نہیں فرقت ہی سہی
کیجئے اغیار سے ملنا موقوف   مجھکو الفت نہیں غیرت ہی سہی
وصل اغیار سے بیوجہ نہیں   میرے مر جانے کی عبرت ہی سہی
دعوی الفت و بیتابی حیف   گر اذیت ہے اذیت ہی سہی
میری خاطر سے چلو شیفتہ وہاں
غیر اون سے تمھیں نفرت ہی سہی

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے   صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

میں دیوانہ ہوں۔ ہرزہ گردی۔ اور بیاباں نوردی۔ بے آرامی وغیرہ میرے لیے بہت ضروری چیزیں ہیں ان سب کو چھوڑ کر جو میں وطن میں بیٹھ رہا ہوں۔ تو صبح وطن

144

میرے ادپر ہنس رہی ہے اور اُسکا ہنسنا بجا ہے کیونکہ آرام در اصل میرے لئے نہیں بنا ہے
یہی بات ہے جسے دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے اور مضمون کو بالکل نیا کر دکھایا ہے

۵ نکوہش ہے سزا فریادی بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

ڈھونڈے ہے اس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

ایسے گانے والے آتش نفس کا گانا سننے کو جی چاہتا ہے جسکی آواز میرے حواس و ہوش عقل جان و دماغ کے ساتھ بجلی کا کام کر جائے۔ یعنی آواز کا شعلہ مجھے پھونک دے یعنی ایسا مست و بیخود ہوں کہ میری ہستی کا نشان باقی نہ رہے مولانا حالی مرحوم ایک شعر لکھتے ہیں

ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

وادیِ خیال کو اس مستانہ روش سے طے کر رہا ہوں کہ اب مجھے اُس استغراق سے اپنے میں آنیکا ہوش ہی باقی نہیں ہے اور اس راستہ کو مستانہ طے کرنیکی وجہ بھی یہی ہے کہ میں کسی خیال میں غرق ہو کر پھر ہوشیں نہیں آنا چاہتا۔ گروں ہوں متروک ہے۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

چونکہ تو باغ میں بے حجابیاں کرتا ہے۔ اور نکہت گل اسکا حظ اُٹھاتی ہے اسی بنا پر اب مجھے نکہت گل سے شرم آتی ہے کہ وہ میری ایک کامیاب رقیب ہے۔ اب میری نظر اُسکے سامنے نہیں اُٹھتی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

چونکہ میں نے ہمیشہ عاشقانہ شعر پسند کئے۔ لوگوں نے میرا حال دل اس سے معلوم کر لیا اور سب مجھکو عاشق سمجھ گئے نظیری نیشاپوری کہتا ہے ۵

راز درونِ سینہ ز رخ پردہ بر انداخت دریغ
حال ما شہرہ بانشائے غزل ساخت دریغ

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

جب ہماری زندگی اس صورت سے گذری کہ کبھی کوئی آرزو پوری نہ ہوئی کبھی کوئی حقیقی خوشی نصیب نہیں ہوئی تو ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ ہمارے کوئی خدا تھا۔ بالکل اسی مضمون کو فارسی میں لکھا ہے

۵ گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

اگرچہ غیروں سے اونکے اشارے ہوتے رہے۔ مگر اُسکی محفل میں میں غیرت سے کام نہیں لے سکتا۔ مجبوراً بیٹھا رہا نہ بیٹھتا تو کیا ہوتا مجبوراً چلکر اپنے گھر چلا آتا۔ اور یہ بھی مجھے منظور نہیں تھا۔
یا یہ کہ لوگ مجھ پر آوازے کستے رہے پھر بھی بیٹھا رہا

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

آخر تیرا یا فولاد تو ہے نہیں میرے پہلو میں بھی اک دل ہے گیا تھا اس ارادہ سے کہ تیرے در پر صدا دوں مگر دربان کمبخت کا خوف معلوم ہوا مجبوراً بغیر صدا دئے ہوئے واپس چلا گیا ورنہ میں اور تیرے در سے بغیر فقیرانہ صدا لگائے ہوئے ٹل جاؤں (بن) متروک ہے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

مدت سے آب و ہوائے بہاری کی دعوت نہیں کی ہے اس لئے مصلے اور عمامہ گرو رکھکر شراب خریدتا پھرتا ہوں۔

بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

عمر اگرچہ کتنی ہی طویل ہو مگر پھر بھی بیفائدہ ہی گذر جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت خضر بھی کل قیامت کے دن کہینگے کہ ہم اتنی طویل مدت تک دنیا میں رہے مگر ہم نے کیا کیا۔ اس میں

ہیں لیجاؤ کاف ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں اچھے نہیں معلوم ہوتے ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

اگر مقدور ہو تو خاک سے یہ پوچھوں کہ اے لئیم اتنے خزانہ تجھ میں دفن تھے تو نے ان سے کیا کام لیا۔ مقدور کا لفظ پتہ دیتا ہے کہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر دولت میرے پاس جمع ہو جائے تو میں لوگوں کو فائدہ پہونچاؤں اور زمین کو طعنہ دوں کہ آخر تو نے اسقدر خزانوں سے کیا کام لیا۔ یا کسی کو کیا فائدہ پہونچایا۔ نظم صاحب گنجہائے گرانمایہ سے وہ معزز لوگ جو مدفون ہو چکے ہیں مراد لیتے ہیں۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

جیسے فقرے تراشنا محاورہ ہے ایسے ہی تہمتیں تراشنا محاورہ ہے یعنی کس دن دشمنوں نے ہمپر تہمتیں بیجا لگا کر ہمپر ظلم نہیں کیا۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

وہ وصل میں بغیر التجا بوسہ دینے لگا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بری عادت دشمن نے سکھائی ہو۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں — بھولے سے اُسنے سیکڑوں وعدے وفا کیے

اگر اسے ضد چڑھ جائے تو خیر لو سکا تو ذکر نہیں مگر واقعی اُسکی عادت بُری نہیں ہے چنانچہ اگر بھول گیا ہے تو بہت سی دفعہ اُسنے وعدے پورے کر دئے ہیں۔

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا — مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

غالب تم وہاں اس بہروسہ پر جاتے ہو کہ وہ ہماری داستاں کو سُن لینگے تو اچھا یہ بھی مانا۔ تم نے اپنا قصہ انہیں سنایا۔ اور اُنہوں نے سُن بھی لیا۔ مگر کیا وہ کچھ جواب بھی دینگے۔ اور تم ہی سوچو تمہیں بتاؤ کہ تمھاری بے تکی بڑ کا وہ جواب کیا دینگے گویا کوئی غمخوار ہے جو غالب کو سمجھا رہا ہے۔

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

جیسے کہ گردش آفتاب سے جسپر صبح و شام کا ہونا منحصر ہے جس سے ہفتہ اور ماہ بنتے ہیں سال کا حساب کیا جاتا ہے اسی طرح سال عمر کا حساب برق سے کرنا چاہیئے یعنی عمر کے سال برق کی طرح تیز گذر جاتے ہیں۔ کیونکہ عمر کی رفتار اُس راہ کو طے کر رہی ہے جو سراسر اضطراب ہے اسلئے برق کو آفتاب بناکر اوس سے حساب کرنا السب ہے۔

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے — بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

بہار کی خوشی میں مینائے مے بہار نشاط کیوجہ سے سرو معلوم ہوتا ہے۔ اور جلوہ شراب کی موج بال کشائی تدرو معلوم ہوتی ہے قمری اور سرو کا ذکر اکثر آتا ہے مگر مصنف نے ایسی ہی تشابیہ کا غیر ردیف ب میں ذکر کیا ہے۔

شعر — پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب — دے بط مے کو دل و دست شنا موجِ شراب

ایک جگہ اور مینائے مے کو سرو کہا ہے۔

شعر — نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب — شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

ایک جگہ شیشۂ مے کو سرِ شیشہ باز کہا ہے۔

شعر — ہے بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے — ہر گوشۂ بساط ہے سرِ شیشہ باز کا

اس سے غالب کی مضامین آفرینی کا اندازہ ہوتا ہے۔

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا — نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

دوسرے ایک شعر میں گویا مصنف نے اسکی شرح خود لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

شعر — ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

یہاں پائے ثبات لکھکر اور زیادہ نازک مضمون کر دیا ہے۔

جاد ادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت — غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

دنیا رنداں بادہ نوش کی جائے داد ہے اور غافلوں کا گمان یہ ہے کہ وہ گیتی خراب آوارہ

دنیا و سعتِ ساماں زمانہ ہیں اگر وہ بے سر و سامان زمانہ ہیں تو ان سے زیادہ اور کون اچھا ہے
ظاہر ہے کہ غم فقر کی رنگ میں اگر دونوں جہان کو اپنا سمجھ لیا جائے تو بھی روا ہے۔ کوئی
روکنے والا نہیں ہے۔ اس حساب سے تمام دنیا کے وہ مالک ہیں

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا　　جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

نظارہ کی کیا طاقت ہے کہ اُسکے جمال کو دیکھ سکے جسکے جلوہ کے لیے جوشِ بہار نقاب
بنی ہوئی ہے یعنی اُس کے جلوہ میں اسقدر بہار ہے کہ جلوہ کو اُس نے چھپا لیا ہے۔ اس مضمون کو
دوسرے طریقہ سے مصنف نے یوں کہا ہے
؎ نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں　　مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

میں نے یہ مان لیا کہ چشم تصور سے میں ہر وقت تمکو دیکھ رہا ہوں۔ یا یونہی تمھارے
رخِ انور پر میری متحیر نگاہیں پڑ رہی ہیں مگر میں تو نامراد ہوں اس سے بھی میری مراد بر نہ آئی
یعنی دل کی تسلی نہیں ہوئی۔ ایک جگہ کہا ہے۔
؎ غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا　　نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو
اس سے ترقی کر کے شعر مانحن فیہ کہا گیا ہے۔

گزرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے　　قاصد پہ مجھکو رشکِ سوال و جواب ہے

اسد میں اس خوشی سے باز آیا کہ قاصد ہمکو پیغام یار سنائے گا۔ مجھے رشک آتا ہے
کہ وہ اُس سے بات چیت کرے گا بیان میرؔ بھی کہتے ہیں ؎
رشک آئے ہے غمخوار مرا حال نہ کہنا　　میں جانہ سکوں واں تلک اور یہی خبر جائے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے　　میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

میری بدقسمتی دیکھیے کہ کسی صورت سے اول تو میں اسکو دیکھ نہیں سکتا اور اگر دیکھنے
کا موقع ملتا ہے تو اپنے اور خود مجھے رشک آتا ہے۔ بھلا میں اُسے دیکھوں مجھ سے کب دیکھا جاتا ہے

اسی مضمون کو مصنف نے کئی جگہ کہا ہے۔
؎ تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن　　وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے
غالباً اسیطرح میں دہلی میں غالب کے زمانہ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا جسمیں اکثر
اساتذہ کی غزلیں ملتی ہیں خصوصاً غالب مومن ذوق مرحوم نے خوب خوب غزلیں لکھی ہیں۔
چنانچہ ہم اُن دونوں استادان فن کے بھی اسی زمین میں مطلع سناتے ہیں۔ دیکھیے ہر شخص نے
کیا دادِ فصاحت دی ہے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک نے ایسا کہا ہے کہ اُس بہتر دوسرا
نہیں مگر غور کیجیے تو نہ تینوں میں کوئی آگے ہے نہ پیچھے سب برابر ہیں۔
ذوقؔ ؎ خوار رخصت اگر زنداں جنوں زنجیر در کھٹکائے ہے　　مژدۂ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
مومنؔ ؎ سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے　　تھامتا ہوں دل کو دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے　　آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اگر اندیشہ کی یہی کیفیت ہے اور ایسی ہی اسمیں گرمی ہے تو دل سے ہاتھ دھو لینا چاہیے کیونکہ
دل ان گرم خیالات کی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسی تیز شراب ہے جسے مینا گداز کہا جا سکتا
یہی مضمون فارسی میں خود مرزا صاحب نے ادا کیا ہے فرماتے ہیں ؎
مینائے مے از تندیٔ مے بہ گدازد　　پیغام غمت در خور تحویل صبا نیست
فرق صرف یہ ہے کہ اردو میں اپنے دل کو مینا اور فارسی میں دل قاصد یا صبا کو مینا قرار دیا ہے
مصنف کا یہ خاص انداز استادانہ ہے کہ جابجا ایک ہی مضمون کو ادا کرتے ہیں مگر ذرا سے تغیر سے شعر
کو نیا کر دیتے ہیں۔

غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے　　گر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

غیر کے چھیڑنے اور گستاخی کرنے سے اسکو شرم آتی ہے تو وہ اس شرم سے بھی شرما جاتا ہے
بقول شخصے کہ ؎
ادا ادا میں ادا نکلتی ہے　　تری ادا کی کہیں انتہا نکلتی ہے
یا شرما جانے سے مراد یہ ہے کہ اسکو شرم ضرور آتی ہے مگر وہ غیر سے بولنے سے اور اُسکے ساتھ
جھگڑا کرنے سے شرماتا ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے — دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

شوق کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ ہر دم نالہ کشی کا خواستگار ہے اور دل ایسا ضعیف ہو گیا ہے کہ اب سانس لینا بھی ناگوار ہے دوسرا پہلو یہ ہے کہ جیسا میرا شوق دیوانہ ہے ایسا ہی دل ہے کہ میں دم لیتا ہوں یعنی ذرا نالہ کشی سے باز رہتا ہوں تو گھبراتا ہے۔ غرض دونوں یکساں ہیں اور میری حالت تباہ کر رہے ہیں

دور چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ — نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

تیری بزم طرب کو خدا نظر بد سے محفوظ رکھے اسمیں سرور افزائی کا یہ حال ہے کہ اگر میں نالہ کرتا ہوں تو وہاں پہونچکر وہ نغمہ بنجاتا ہے۔ یعنی چاہیئے یہ کہ وہ کسی کے دل پر اثر کرے اور افسوس ہو مگر برعکس اسکے وہاں اوسکو سب لوگ سنکر خوش ہوتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ ایک جگہہ اور فرماتے ہیں۔

ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست — واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبار نغمہ ہے

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اگرچہ وہ ہم سے ہمارا راز عشق چھپانے کے لئے بزم میں تغافل برت رہا تھا ہے مگر وائے بر حال ما کہ ہم تغافل سے ششدر و متحیر و پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور اسکو وہ سمجھ جاتا ہے مجبوراً اسکو ہم پر ستم کرنا پڑتا ہے۔

مومن ع کل تم جو بزم ناز میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

اسکی بزم آرائیاں سنکر دل رنجور یاں — مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

جب سنتا ہوں کہ اغیار کے ساتھ اوسنے محفل آرائی کی ہے تو میرا دل ایسا بیٹھا جاتا ہے جیسے غیر کا وہاں سکہ بیٹھا ہوا ہے یا جیسے اوسکا وہاں نقش بیٹھا ہوا ہے۔

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا — رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

وہ پری رو جو دوسرو پر عاشق ہو کر لاغر ہوا اور رنگ اڑ کر اوسکا رنگ سفید ہو گیا ہے تو اور نازک بن گیا ہے۔

نقش کو اسکے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں — کھینچتا ہے جسقدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

اسکے نقش کو مصور پر بھی کیسے کیسے ناز ہیں وہ اسکو کھینچتا ہے۔ مگر وہ اسکو اپنا عاشق سمجھکر اوس سے کھنچتا جاتا ہے۔ دو لفظوں کے جمع ہونے سے یہاں ایک لطف پیدا ہو گیا ہے۔ دوسرا پہلو اسمیں یہ بھی موجود ہے کہ اسکی تصویر مصور پر بھی ناز کرتی ہے وہ اسکو کھینچتا ہے مگر وہ اس سے کھنچتی جاتی ہے۔ یعنی نہیں کھنچتی۔ حاصل یہ کہ مصور بوجہ نزاکت کے اوس کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد — پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

جیسے دھواں آگ سے بھاگتا ہے ایسے ہی میرا سایہ مجھ سے بھاگتا ہے۔ سچ تو ہے مجھ پر سوز و غم کے پاس کس سے ٹھہرا جاتا ہے۔ ایک جگہ یوں کہا ہے۔

ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجو — سایہ ہمچوں دود بالا میرود از بال ما

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے — تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

شکل نہالی وہ جو بستر پر تصویریں وغیرہ بنی ہوتی ہیں مصنف کہتا ہے کہ شب غم میں میں نے جو تصویر نہالی کو دیکھا اور اسپر تو یاد آیا کہ آہ یہ تصویر پہلو میں ہے اور تو نہیں ہے تو اسپر میں گرم نالہ و فریاد ہوا اور اپنا پہلو گرم کیا۔ ورنہ شب ہجر کی سردی مجھے چین نہ لینے دیتی۔

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم — لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

میری عالی ہمتی نے مجھے دونوں عالم کے نسیہ و نقد کے ہاتھ نہ بکنے دیا۔ لیکن ان دونوں سے مجھے خود خرید لیا یعنی میری بلند ہمتی نے غم کونین کی پرواہ نہ ہونے دی۔ اور کبھی مجھے دنیا و عقبیٰ کی فکر نہیں رہی۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم — کردیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

یعنی وحدت کو لباس کثرت میں آراستہ کرنا اور وحدت کے ساتھ کثرت کا شمار رکھنا یہ وہم کے سوائے اور کچھ حقیقت نہیں رکھتا ہے۔ اور انہیں خیالی اصنام نے مجھے کافر بنا دیا ہے۔ یعنی وحدت کے ساتھ ہی ساتھ کثرت کا خیال آتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب وحدت کے ساتھ کوئی دوسرا خیال آیا تو حقیقتاً وحدت کو وحدت نہ سمجھا۔ اور یہی علامت کفر ہے۔ یا یہ کہ یہ خیال کرنا کہ کثرت وحدت سے ہے تو یہ پرستاری وہم اور باعث کفر ہے انہیں ایک کے ساتھ دوسرے کا ذکر نہ کرنا چاہیے۔

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا — خواب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

اب کبھی مجھے خیال میں بھی سیر گل و گلستان کا خیال نہیں آتا میری بے پروبالی نے مجھے بہت آرام دیا سودا سے

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے — کہ جنے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے — برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

مصنف مرحوم نے خود ان تینوں شعروں کا عود ہندی میں مطلب بیان کیا ہے لہذا وہی لکھدینا زیادہ مناسب ہے۔ داغ ساماں مثل انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جسکا سرمایہ و ساماں ہو موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے بعد اسکے یہ سمجھ لیجئے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقاں کو بونے جوتنے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے مزارع کا۔ وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے۔ وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت اور صورت رنج ہے یہی اسی مضمون کا شعر گذر چکا ہے۔ اوسمیں کچھ تغیر ہے۔ حاصل اوسکا بھی یہی ہے۔

سے مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولے برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غنچہ تا شگفتنہا برگ عافیت معلوم — باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے

یعنی کلی جب تک کھلے کھلے ساز و برگ عافیت کا حاصل ہونا یعنی آفت سے اوسکا محفوظ رہنا کہاں سے معلوم ہے جب یہ حال ہوا تو گل کو باوجود دلجمعی پریشانی ہے اور غنچہ کو دل سے تشبیہ ہے اور جمعیت دلکی صورت بھی اُس سے ظاہر ہے اسیطرح گل شگفتہ کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا پریشانی کی صورت ظاہر کر رہا ہے اور گل کی خاموشی اور بیرجانا اندگی خواب کا عالم دکھا رہی ہے غرض یہ کہ تینوں حالتیں گل پر طاری رہتی ہیں تو باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں رہتا ہے اور سبب پریشانی کا یہ ہے کہ اُسے اندیشہ ہے کہ دیکھیئے ساز و برگ عافیت اس دار بلا میں ممکن ہوتا ہے یا نہیں۔ ایسا ہی مضمون ہے جیسے دوسرے لباس میں یوں جلوہ گر کر چکے ہیں۔

سے دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ — دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہمسے رنج بیتابی کسطرح اٹھایا جائے — داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

مطلب یہ کہ اس رنج کی تاب ہمسے نہ ہو سکے گی اور یہ ہلاک کر دے گا دست عجز سے وہ ہاتھ مراد ہے جو صدمہ کے دفع کرنے سے عجز رکھتا ہے۔ اسی سبب سے اُسے خس سے تشبیہ دی ہے اور داغ کو شعلہ سے پشت دست زمین پر رکھنا عاجزی کرنے کے معنی پر ہے یہ ظاہر ہے کہ شعلہ کی آفت کو خس نہیں اُٹھا سکتا وہ اُسے جلا کر فنا کر دیتا ہے۔ اور خس بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز کے معنی پر ہے یہ دوسرا پہلو اس شعر کے معنی میں نکلتا ہے یعنی میرے دست عجز کا داغ شعلہ خس بدنداں ہے کہ میری طرف سے اظہار عجز کر رہا ہے کہ رنج بیتابی اس سے نہ اُٹھ سکے گا۔

یہ وہی اشعار ہیں جو مرزا مرحوم نے بیدل اسیر و شوکت کے رنگ میں کہے تھے اور جنمیں سے چند شعر اس دیوان میں باقی رہ گئے ہیں۔

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

ہم جنگلوں میں خاک اڑاتے پھرتے ہیں اور گھر اتنا ویران ہو گیا ہے کہ وہاں در و دیوار

سبزہ جما ہوا ہے گویا بہار آئی ہے۔ اس سے دو پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایسے دیوانہ ہیں کہ بہار کو چھوڑ کر جنگلوں میں پھرتے ہیں اور بہار کی بھی پروا نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ گھر کو چھوڑے ہوئے اتنا عرصہ گذر گیا کہ اب وہ جنگل بن گیا۔ ہمشکل شعر کہا ہے۔ اس مضمون کو بھی مختلف پیرایوں میں مصنف نے کئی جگہ لکھا ہے۔ مثلاً

اگا ہے گھر میں سبزہ میری ویرانی تماشہ کر مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

سادگی پر اُسکی مرجانے کی حسرت دل میں ہے بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

میں چاہتا ہوں کہ اُسکی سادگی پر اپنی جان دیدوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں کہ وہ ہاتھ میں قتل کرنے کے لیئے خنجر لیئے ہوئے ہے اور میری سادگی پر مرجانے کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔ سادگی سے مراد یہی ہے کہ خنجر اُسکے ہاتھ میں نہو۔ پھر سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ کئی مرتبہ سادگی پر مرنے کا ارادہ کر چکے ہیں مگر وہ ایسا ظالم ہے کہ جب انہیں دیکھتا ہے خنجر ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ ایک جگہ صاف الفاظ میں یوں کہہ چکے ہیں

ع اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

گویا مصنف کے نزدیک سادگی خنجر سے زیادہ قاتل ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُسنے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

میں اُسکی لذتِ تقریر میں اتنا محو ہوں کہ جو کچھ وہ کہتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات میرے دل میں تھی۔ یا یہ کہ جو بات وہ کہتا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ اسی بات کے سننے کی مجھے حسرت ہے۔ یا یہ کہ اوسکی ہر ایک بات اتنی دلفریب ہے کہ اوسکے ہونٹوں سے نکلتے ہی میرے دل میں اُتر جاتی ہے۔

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے اچھا ہے جو اس محفل میں ہے

اگرچہ میرا ذکر برائی سے کیا جاتا ہے مگر باوجود ان سب باتوں کے میرا ذکر مجھ سے بہت اچھا ہے کہ اُس محفل میں وہ پہونچ تو گیا۔ میں تو کسی طرح وہاں جا ہی نہ سکا۔

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائیگی یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

اے ہجوم یاس و ناامیدی میرے حال زار پر ترس کھا اور میرے دل میں تمنا اور دعا کام کرے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ ہماری سعی بے حاصل ہے مگر ہمکو اسی میں اک لطف آرہا ہے۔ تو اسے پامال نکر۔

رنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

میں جہاں تھک کر بیٹھ جاتا ہوں وہی اپنی منزل خیال کرتا ہوں اور میری واماندگی کو اسی منزل سے جو فی الحقیقت منزل نہیں ہے عشق ہے۔ اسی کی وجہ سے جو قدم منزل پر پڑتا ہے وہ پھر اُٹھ نہیں سکتا۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی فتنۂ شورِ قیامت کسکی آب و گل میں ہے

یہ خاص مصنف کا طرز بیان ہے اور مضمون ایسی خوبصورتی سے ادا کرنے میں مرزا غالب مرحوم کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ اچھا آپ ہمکو فرماتے ہیں کہ تیرے دل میں تو ایک دوزخ بھری ہے اور وہ بھڑک رہی ہے مگر یہ بھی تو مہربانی کرکے بتا دیجیے کہ فتنۂ شور قیامت کون ہے۔ وہ حضور ہیں نہ آپ سراپا حشر ہوتے نہ ہمارے دل میں دوزخ ہوتی۔ یعنی دوزخ تو یقینی قیامت سے کو بھڑکائی جائیگی اسی انداز بیان کا ایک شعر مصنف کا فارسی میں ہے

ع سجود بوقت ذبح طپیدن گناہ ما دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست

ہے دل شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

غالب کا دل دل نہیں ہے بلکہ طلسم پیچ و تاب ہے اور اسی میں تیری تمنا ہے لہذا اگر تو غالب کے دل پر رحم نہیں کرتا تو خیر مگر اپنی تمنا پر تو رحم کر کہ کس مشکل میں ہے۔

دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

تیری نگاہ کا تیر ایسا دلدوز تھا جو جگر دوز بھی ثابت ہوا اور تیری ایک نگاہ دل سے

لیکر جگر تک چلی گئی چونکہ دونوں اُسکے منتظر تھے لہذا دونوں رضامند ہوگئے۔

شق ہوگیا ہے سینہ خوشا لذت فراق — تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

لذت فراق بڑی اچھی چیز ہے جس سے ہمارے چھاتی شق ہوگئی ہے اور ہمیں زخم جگر کی پردہ داری سے نجات ملگئی۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اُٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اب وہ شراب جوانی کا نشہ باقی نہیں رہا ہے اب لہذا ہمکو بیدار ہونا چاہیئے بادۂ شبانہ استعارہ ہے جوانی سے اور سرمستیاں جوانی کے افعال سے خواب سحر بھی جوانی کی بیخبری استعارہ کیا ہے اسواسطے کہ صبح کی نیند میں بھی ایسی ہی غفلت ہوتی ہے جیسی کہ جوانی میں

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں — بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

میرے خاک یار کی گلی میں اڑتی پھرتی ہے خیر اے ہوا میں تیرا ممنون ہوں کہ میرے دل سے بال و پر کی ہوس جاتی رہی۔ یعنی ظاہر ہے کہ اگر تو مجھکو نہ اڑاتی تو بال و پر کی حسرت ہوتی ہے۔

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا — موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

گل کترنا۔ کوئی تعجب کا کام کرنا۔ یا ایسا کام کرنا جس میں فتنہ و فساد ہو۔ یہاں پہلے معنی لیئے گئے ہیں مصنف کہتا ہے کہ ذرا اُسکے انداز نقش پا کی دلفریبی دیکھیئے کہ اُسکی موج خرام نے رستہ میں کیسے گل کترے ہیں۔ یعنی قدم قدم پر چمن نہار بنا دیا ہے۔ کہ دل کے دل اور سیر فریفتہ ہورہے ہیں۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

میرے نظارہ نے بھی وہاں نقاب کا کام کیا۔ اسطرح سے کہ جب وہ رخ پر پہونچا تو

مست ہوگیا اور وہیں منتشر ہوکر ڈھیر ہوگیا۔ اس صورت سے نظارہ نقاب بنا۔ بہت خوب شعر کہا ہے اور اسمیں عاشق کی محرومی کا سلسلۂ وجہ الکمال نقشہ کھینچ دیا ہے۔ یعنی جب نظارہ جمال یار کا نقاب تو پھر اب اوسکے دیکھنے کی کیا توقع ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

یعنی اب بوالہوس بھی عاشق بن گئے تو اصلی عاشقوں کی کیا عزت رہیگی۔

حالیؔ ہ فریاد کہ عاشق زہوسناک ندانی — در پیش تو استاد و نو آموز مساویست

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا — کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

دی روز۔ گذشتہ کل۔ اور فردا آنے والی کل۔ جس سے شعرا کے یہاں اکثر قیامت مراد لی جاتی ہے کہتا ہے کہ کل جب تم گئے تو ہماری نظر سے۔ فردا اور دی کا فرق مٹ گیا۔ اور گذشتہ کل ہی فردائے قیامت ہوگئی۔

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمھیں — وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

ہائے اسد اللہ خاں زمانہ نے تمکو مار دیا ارے اب وہ تمھارے ولولے اور تمھاری وہ جوانی کیا ہوگئی اسد اللہ خاں اسوجہ سے کہا ہے جس سے اُسوقت کا سطوت و جبروت ظاہر ہو بہت ہی خوب شعر کہا ہے۔ اسکی صفائی اور چستی بندش نے اسمیں کوٹ کوٹ کر مضمون بھر دیا ہے۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے — حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

ہمکو تسکین دل کی فکر نہیں ہے دل کو تسلی ہو یا نہ ہو۔ چاہتے یہ ہیں کہ بہشت کی حوروں میں کوئی تیری سی صورت ملجائے۔ اگر ایسا ہو تو تسکین دل نہ سہی ذوق نظر تو ہوگا ہم اسی پر قناعت کرینگے۔

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعد قتل — میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

تو اپنی گلی میں مجھے دفن نکر ورنہ تو دنیا میں تو قاتل مشہور ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں نہیں چاہتا کہ تیرے پاس رقیب آئیں اور میری قبر کا پتہ پوچھتے پوچھتے آئیں مجھے میرا رشک اسے گوارا نہیں کرتا۔ تیسرے یہ کہ تیرے نام کے ساتھ میں اپنا نام رکھنا نہیں چاہتا۔ یعنی تیرے وجود کے سامنے میں اپنی ہستی اور اپنی قبر تک کے نام مٹا دینے کے واسطے بھی تیار ہوں۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

گویا معشوق ساقی بزم ہے اور یہ بلا نوشی اور خم آشامی پر اُتر آئے ہیں وہ دو چار جام ان کو پلا چکا اور ان کا دل سیر نہیں ہوا برابر سوال جاری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بس جتنی تو پیتا ہے اسکے موافق ہم تجھکو پلا چکے اب نہ دینگے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

اے ندیم خیر تجھ سے تو کچھ نہیں کہتے مگر اتنا کہ اگر کہیں نامہ بر ملجائے تو ذرا ہمارا اسلام کہدینا۔ کہ واہ خوب ہمارے خط کا جواب لائے کیا خوب شعر کہا ہے اور بھی کئی پہلو اسمیں موجود ہیں

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

مجنوں کی تعریفیں کیا ہمارے سامنے بیان کرتے ہو۔ وہ آزاد تھا کہ جنگلوں وغیرہ میں نکل گیا۔ مگر ہم کو تو غم پنہاں روک روک کر رکھتا ہے اگر اس سے ذرا ہمیں فرصت ملے تو ہم بھی تمکو بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا۔ اس سے دو مطلب پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ مجنونانہ حرکات کا تماشہ تم کو دکھائیں۔ ایک یہ کہ ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا اور ہم کیا کرتے ہیں گویا مجنوں نے ہمارے مقابلہ پر کچھ بھی نہ کیا تھا۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

ہمکو اسکی ضرورت نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام کی پیروی کریں۔ ہم ان کے ساتھ رہنے کو صرف اپنا ہم رتبہ سمجھنے پر انحصار کئے ہوئے ہیں۔ جیسے ہم ویسے وہ۔ حاصل یہ کہ ہم نے خضر کے برابر جنگلوں کی سیر کی ہے۔

اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

اے ساکنان کوچہ دلدار ذرا دیکھنا اگر تمکو کہیں غالب مل جائے۔ اسمیں ذرا دیکھنا کثیر المعنی لفظ ہے جس سے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ذرا اوسکی حالت زار دیکھنا۔ یا ذرا دیکھنا وہ آج کس رنگ میں ہے۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اگر ہماری زندگی کچھ دنوں باقی رہی تو ہم نے بھی اب اپنے دل میں کچھ اور ٹھان رکھی ہے دوسرے مصرع سے بہت سے معانی نکلتے ہیں۔ اور یہ کمال فصاحت ہے۔ نہ حسب الارشاد جناب مولانا نظم صاحب کہ اسمیں المعنی فی بطن الشاعر ہے کیونکہ جو الفاظ دوسرے مصرع میں لائے گئے ہیں یہ زبان زد عوام ہیں کہ اگر تم ایسا نکرو تو ہمارا بھی ایسا ارادہ ہے یعنی تمکو کسی نہ کسی صورت سے اسکا بدلہ دینگے۔ یا یہ کہ ہم بھی مر جائینگے۔ اور اس قسم کے ہزارہا الفاظ مروج اور داخل روزمرہ ہیں۔ جیسے اچھا ہم تو تمکو مزا چکھا دینگے۔ یا ہم بھی تمکو دکھا دینگے وغیرہ وغیرہ۔ اسمیں شک نہیں کہ اسکی بندش نہایت چست ہے مگر غلطی کو چستی بندش نہیں مٹا سکتی۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوز غمہائے نہانی اور ہے

یعنی سوز غم آتش دوزخ سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور حرارت میں بڑھا ہوا ہے

بارہا دیکھی ہیں اون کی رنجشیں پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

ہم سے اون کی رنجشیں کئی مرتبہ دیکھی ہیں مگر اسمرتبہ بیطرح خفا ہوئے ہیں سو خدا ہی خیر کرے آج رنگ بیٹھے بیٹھے پھر ٹپک رہا تھا کئی دن سے آبلہ دل کا۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

نامہ بر خط دیکر میرا منہ دیکھ رہا ہے کچھ نہ کچھ پیغام اوسکے دل نے اور بھی کہا ہے۔

یعنی ضرور مجھے بُرا بھلا کہلا بھیجا ہے۔ یا یہ کہدیا ہے کہ اب تو میں نے جواب دیدیا ہے آئندہ سے میرے پاس کوئی خط نہ لکھنا وغیرہ وغیرہ مصرع ثانی سے بہت سے پہلو نکل سکتے ہیں۔

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم　　وہ بلائے آسمانی اور ہے

ستارے اکثر عمروں کو قطع کرتے ہیں۔ یعنی ان کی گردش شبانہ روز سے زندگی کا خاتمہ ہوتا ہے مگر میرا معشوق کچھ اور ہی ہے۔ وہ زندگی کو بھی موت سے بدتر بنا دیتا ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

غالب اوس کے عشق میں اور تو سب بلائیں ہم اٹھا چکے بس اب ایک یہ باقی رہ گیا ہے کہ ابھی صدمہ میں کسی دن یکایک موت آجائے۔

تمام غزل کے اشعار میں جستی بندش اور روزمرہ زبان وغیرہ کی داد نہیں دی جا سکتی۔ جو لوگ غالب کو مشکل گو تصور کرتے ہیں اونکو عبرت پکڑنی چاہیئے۔ یا جو لوگ بزعم خود غالب کا اتباع کرتے ہیں اور موٹے موٹے الفاظ ٹھونس دیتے ہیں اونکو ایسی غزلیں دیکھنی چاہئیں۔

کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

میری کوئی امید پوری نہیں ہوتی نہ کوئی امید پوری ہونیکی صورت معلوم ہوتی ہے یا یہ کہ اتنی امید بھی پوری نہیں ہوتی کہ کوئی صورت (یعنی معشوق کی صورت) نظر آجائے۔ یا کوئی صورت نظر نہیں آتی جس سے امید پوری ہونے کی امید ہو۔

موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

موت تو یوں نہیں آتی اوسکا ایک وقت مقرر ہے وہ اپنے وقت معینہ پر آئیگی مگر نیند کو آنے میں کیا عذر ہے وہ رات بھر کیوں نہیں آتی یا یہ کہ موت اپنے وقت پر آکر رہیگی۔ آخر نیند اسکے فکر میں کیوں اڑ گئی ہے۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

میرا غم شب و روز ترقی پر ہے پہلے یہ حالت تھی کہ اور کسی بات پر نہیں مگر اپنے دل کی دیوانگی پر ضرور مجھے ہنسی آجاتی تھی اب یہ عالم ہے کہ اوس پر بھی ہنسی نہیں آتی۔ اس شعر کی تعریف غیر ممکن ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہ نہیں ہے کہ میں زہد و اتقا کے ثواب سے ناواقف ہوں نہیں اسکے ثواب کو جانتا ہوں۔ مگر بدقسمت ہوں طبیعت افعالِ بد کی طرف رجوع ہوتی ہے ادھر طبیعت کو رغبت نہیں ہوتی۔ اس سے اس مسئلہ پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے۔ کہ ایمان کے لئے کچھ تصدیق بالقلب ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اقرار باللسان بھی ضروری ہے۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

پہلے مصرع کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ جس سے کئی پہلو نکلتے ہیں یعنی۔ میرا خاموش رہنا ہی اچھا ہے اسمیں مصلحت ہے ممکن ہے کہ میں کچھ کہوں اور اسمیں دل کی کوئی شکایت اور گلہ لب پر آ جائے اور وہ ناراض ہو جائیں یا یہ کہ میری کون سنیگا۔ یا معشوق نے مجھکو منع کر دیا ہے۔ یا عشق نے مجھ میں بولنے کی طاقت باقی نہیں رکھی ہے۔ غرض ایسے ہی کچھ اسباب ہیں کہ خاموش ہوں ورنہ میں بھی زبان رکھتا ہوں۔

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں　　میری آواز گر نہیں آتی

اگر میں نہیں روتا تو وہ مجھے یاد کرتے ہیں کہ آج وہ کیوں نہ رویا۔ چونکہ معشوق کو میرا اس صورت سے نالہ و فریاد کرنا بھلا معلوم ہوتا ہے اس لئے مجھے مجبوراً رونا پڑتا ہے۔ یا اگر میں نہیں روتا تو وہ مجھے یاد کرتے یعنی بلاتے ہیں اور مجھکو تاکید نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ یا مجھپر ستم کرکے نالہ کشی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مجھے یاد بھی کرتے ہیں تو میرے دکھ درد اٹھانے کے لئے یاد کرتے ہیں۔

داغِ دل گر نظر نہیں آتا　　بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

اگر تجھے میرا داغ دل دکھائی نہیں دیتا تو کیا تجھے داغ کی بو بھی نہیں آتی۔ یعنی میری محبت سے انکار ہے تو کیا تو میرے انداز مجنونانہ سے نہیں پہچان سکتا۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

یعنی اب ہمارا یہ حال ہے کہ اپنے حال کی بھی خبر نہیں دوسروں کی تو کیا خبر ہے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

میں کثرت شوق و انتظار موت سے مرا جاتا ہوں۔ مجھے موت آتی ہے مگر موت نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب — شرم تم کو مگر نہیں آتی

کیوں غالب کعبہ کا جو ارادہ کر رہے ہو وہاں جاتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی کہ ساری عمر بت پرستی میں صرف کرتے رہے ہو اب تم ہرگز اس قابل باقی نہیں رہے ہو کہ تم کعبہ کو جاؤ ذرا شرم کرو۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اے دل ناداں تجھے یہ کیا ہو گیا ہے آخر تیرے اس مرض کی تیری اس وحشت کی کیا دوا کروں۔ یہ بطریق ملامت ہے۔ دوسرا پہلو یہ نکلتا ہے کہ حضرت دل آپ جو مجھ سے کہتے ہیں کہ میرا علاج کیجیے میری خبر لے۔ پہلے تو یہ بتا کہ تجھکو ہوا کیا ہے کہ جس کی کچھ دوا کیجائے۔ یا فرض کیجیے کہ آپ اپنی حالت کو مرض ہی سے تعبیر کرتے ہیں تو اس مرض کی دوا ہے کہاں کہ میں علاج کا ارادہ کروں۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ دل سے پوچھتا ہے کہ کم بخت تو اپنا مرض تو بتا۔ تجھے یہ کیا ہو گیا جو تیری حالت شب و روز تباہ ہوتی جاتی ہے کچھ اپنے مرض کی روداد بتا کہ اوسکا علاج کروں تو تو چھپاتا ہے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

یہ سنا ہے کہ دنیا میں دلکو دل سے راہ ہوتی ہے۔ مگر یہاں عجیب حالت ہے کہ ہم اُس سے

مشتاق ہیں اور وہ ہم سے بیزار ہے۔

مومن:
ہم اسکو چاہیں وہ ہم سے خفا ہو — دلا یہ بھی تو ہے قدرت خدا کی

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

عاشق بر بنائے رعب حسن بزم معشوق میں اسقدر خاموش رہا ہے کہ معشوق اُسکو گونگا سمجھنے لگا ہے اُس شبہ کے مٹانے کے لیے کہتا ہے کہ جو تم نے سمجھا ہے دراصل یہ بات نہیں ہے بلکہ زبان میرے منہ میں بھی ہے کاش کسی روز تم میرا مدعائے دل مجھ سے پوچھو تو پھر میں تم سے بیان کر دوں
یا یہ کہ غیر کا حال تم پوچھتے ہو کاش تم کسی دن مجھ سے بھی میرا مدعائے دل پوچھو تو تمسے کچھ کہوں۔

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اے خدا جب تیرے سوائے اور کوئی نہیں ہے تو پھر آخر یہ ہنگامہ ہستی کیا ہے۔ اور یہ منظر اسقدر دلفریب کیوں ہے۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

یہ حسینان جہاں کیسے ہیں اور یہ انکے ناز و ادا آخر کیا بلا ہیں۔

شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

زلف پیچدار کی شکن اسقدر عنبریں کیوں ہے اور آنکھ سرمہ سا کیوں ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ لہلہاتا سبزہ۔ یہ رنگ برنگ کے پھول۔ کالی کالی گھٹائیں یہ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں یہ کیا چیز ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی چیزوں کو نہیں دیکھتے ہیں انکو دیکھنا چاہیے اور متوجہ ہونا چاہیے کہ جو دلفریبیاں زمانہ میں ہیں وہ سبھی اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ اور اگر کچھ نہیں ہے تو آخر یہ کیا بلا ہیں۔ نہیں یہ سب صنعتیں صانع نے چشم حقیقت بیں کے لئے پیدا کی ہیں کہ ان کو دیکھ کر انسان صانع حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائے۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

افسوس مجھ کو ایسے جفا کار سے امید وفا ہے جو وفا کا نام بھی نہیں جانتا کیا یکا و بیگم میں
اور وہ ہو تو جفا کو نہیں پہچانتا۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نہیں جانتا کہ دعا کیا بلا ہے لیکن تم پر جان دے سکتا ہوں برعکس معشوقوں کے جو
محض زبانی جمع خرچ سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ یا یہ کہ میں اپنے مرنے کی دعائیں کیوں کروں
لے تو اپنی جان دے دیتا ہوں

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا　　اور درویش کی صدا کیا ہے

گویا خود ایک فقیر ہیں اور معشوق سے کہتے ہیں کہ بھلا کر خدا تیرا بھلا کرے گا یہی فقیر
کی صدا ہے اور وہ بھی سچ کہتا ہے۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب　　مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غالب اگرچہ بالکل نکما اور ناکارہ ہے۔ مگر بندۂ بے درم ہے اور یہ مشہور ہے کہ
مفت را چہ گفت۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے　　یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

اے تیمار دارو تم سب یہ تو کہہ رہے ہو کہ کسی نہ کسی صورت سے اگر وہ بتِ غالیہ مو آ جائے
تو غالب کو کچھ تسکین ہو۔ مگر کیا اچھا ہو کہ اگر تمہاری زبان سے گھبرا کر یہ نکلے کہ لو وہ
آ گئے وہ آ رہے ہیں۔ تو مجھے ابھی تسکین اور آرام ہو جائے غزل کا مطلع اسی قافیہ میں ہے
یا آئے اجل یا صنم عربدہ جو آئے　　ایسا نہ ہو یا رب کہ نہ یہ آئے نہ وہ آئے

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت　　کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

اے جذبۂ الفت تو دیکھتا ہے کہ میں نزع کی کشمکش میں ہوں اور مجھ میں طاقت گویائی باقی نہیں
ہے مگر تو میرا اتنا کام کر دے کہ وہ کسی نہ کسی صورت سے یہاں آ جائے چاہے میں اس سے کچھ اُن کو
یا اپنا سکون کم ہو کم اُن کو دیکھ کر اپنے دل کو تسکین دے دوں غالباً اسی حقیقت کو لکھتے ہیں
اتنے بھی تو آتے ہی لگے پھیرنے چتون　　کیا آئے وہ گر تیر سے جگر پھیر کے گو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم　　آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

میرے معشوق کا آنا بھی ایسا آنا ہوتا ہے جسے نہ آنے سے مشابہ کر سکتا ہوں شعلہ و سیماب
و برق کی سی اس کی حالت ہے جیسے انھیں قیام نہیں ویسے ہی اُسے بھی نہیں۔ لہٰذا وہ آ سکا ہو تو بھی
میری سمجھ میں نہیں آتا اگرچہ وہ آئے بعض نسخوں میں (آنا ہی) مصدر کے بجائے حال یعنی آتا ہی
لکھا ہے وہ بھی صحیح ہے اور اس صورت میں یہ معنے ہیں۔ کہ میرا عالم وہی شعلہ و سیماب کا سا ہے
کوئی کمی نہیں ہوئی اس سے میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وہ نہیں آتا۔ اب چاہے آ ہی جائے
مگر مجھے یہی خیال ہے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین　　ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

شراب پینے سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ قبر کی بازپرس سے بچ گئے۔ یوں تو نکیرین مر بھاگتے مگر چونکہ
وہ نور سے پیدا ہوئے ہیں میرے منہ کی بدبو سے بھاگ جائیں گے اور پاس نہ آئیں گے
اور یہ ضرور ہے کہ شراب کی بو منہ سے آئے مولانا نظم نے لکھا ہے کہ منہ سے بو آنے کا مضمون
لکھنے کے قابل نہ تھا۔ بیشک یہ صحیح ہے۔ اسمیں بڑا نقصان تو یہ ہے کہ فرشتوں کی حاضری
معلوم ہے دوسرے مضمون نہایت رکیک ہے۔ کم از کم ایسے مضامین سے احتیاط لازم
مگر غالب نے تو خیر اسی قدر لکھا ہے بعض لوگ تو خدا جانے کیا کیا لکھ جاتے ہیں مثلاً
پوچھنا ہے طنز سے کیا باندھی ہے کس پر کمر　　باندھی ہے پیر کمر کو اور ترا شلوار نیچے
حسرت جلوہ دیدار بہت ہے مجھ کو　　چاہیے میرے لئے آئینہ تمام شب وصل
مرتے ہیں رشک سے اور سے لپٹ یار رقیب　　شور کرتا ہے جو پازیب کا نام شب وصل
پھر تنگ میں ملتا ہے تو کہتا ہے وہ شوخ　　مرد ہے وہ کہ جو آ کر مجھ سے ملے ہٹ کے
مضامین اس قدر رکیک ہیں کہ آجکل شاعری میں ان کی گنجائش نہیں ہے نہ کبھی پہلے تھی۔ چنانچہ

155

کامل عاجزوں کے رودادیں اسکے شاہد ہیں۔ اب بالکل قابلِ ترک ہیں

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہر شخص میں تجھی کو دیکھتے ہیں لہذا نہ جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہیں گویا تو نے اپنا بھیس بدل لیا ہے۔ مگر اس تبدیل لباس سے ہم دھوکا نہیں کھاتے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت را می شناسم

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اے اہلِ طلب جب باوجود تلاش وہ ہمکو نہ ملا تو ہم اسقدر حیران ہوئے کہ خود کھوئے گئے اور اس صورت میں اچھے رہے۔ ورنہ لوگ یہ طعنہ دیتے کہ ڈھونڈھا اور نہ پایا۔ ہاں تاکید وتنبیہ کے لئے ہے یعنی ایسا ہی چاہیے۔

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

ہمارا شعار یہی کہ آرام سے نہ بیٹھیں اُسکو ڈھونڈھنے گئے تھے وہ نہ ملا کعبہ کو چلے گئے گویا کعبہ کا جانا کسی ثواب کے حصول کی نیت سے نہ تھا۔ بلکہ ایک وقت گذارنا مقصود تھا یا ہرزہ گردی کی گویا ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

میرے دوستوں نے جس سے میرے نالہ کی بے اثری کے بارہ میں تقریر کی۔ کہ وہ غریب رات دن روتا ہے اور اسپر اس کو یہ ثابت ہو گیا کہ وہ بے اثر ہیں۔ یعنی سمجھے کہ وہ اتنا روتا ہے اور پھر بھی ہمپر کوئی اثر نہیں ہے تو یقیناً نالہ کی بے اثری کا اظہار اُسپر ہوا۔ تو اس حساب سے دوست تو اچھے رہے کہ انہوں نے میرے اوپر اپنا احسان ثابت کر دیا۔ مگر مجھے ڈبو دیا۔ یعنی کبھی کبھی جو میں اُسکو اپنے نالہ و فریاد کے اثر کی دھمکی دیتا تھا اب وہ بھی گئی۔

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

اُس محفل کی کیا بات ہے ہم بھی وہاں گئے تھے اور غالب تیری تقدیر کو رو آئے یعنی اسپر رنج کر آئے کہ ہائے ایسی انجمنِ ناز میں اور اسکا گذر نہیں۔ یا یہ کہ اوس سے قصہ بیان کر کے ظفر مرحوم نے اسی قافیہ کو یوں کہا ہے ؎

خوش ہونا کہاں جبکہ نصیبوں میں ہو رونا ہم شمع صفت محفلِ شادی میں بھی رو آئے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر دلکو کچھ اک بیقراری سی ہے ہمارا سینہ زخمِ کاری کو ڈھونڈھتا ہے۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

فصلِ بہار کی آمد ہے لہذا میرے ناخن پھر جگر کھودنے لگے۔ یا یہ کہ جگر کے زخمی ہونے سے لالہ کاری بنائی ہے۔ جگر کھودنا۔ جگر کاوی کا ترجمہ ہے۔

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز پھر وہی پردۂ عماری ہے

پھر اُسی عماری کا پردہ ہمارا نیاز کشی کا قبلہ اور کعبہ بنا ہوا ہے۔

چشم دلالِ جنسِ رسوائی دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

دل ذوقِ خواری اور رسوائی کا خریدار بننا چاہتا ہے اور آنکھ اوسکی دلالی کر رہی ہے یا ظاہر ہے کہ آنکھ ہی پھنساتی ہے۔

وہی صد رنگ نالہ فرسائی وہی صد گونہ بیقراری ہے

وہی طرح طرح کے نالہ کرنا۔ اور وہی سو طرح سے بیقرار ہونا۔ پھر شعار ہو گیا ہے۔

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر محشرستانِ بیقراری ہے

خرام ناز کی خواہش نے پھر دل میں قیامت برپا کر رکھی ہے چونکہ خرام ناز کا کام
قیامت برپا کرنا ہے اسلئے اُسکے خیال نے بھی قیامتیں اُٹھا رکھی ہیں

جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے　　روز بازار جاں سپاری ہے

جلوہ یار نے ظاہر ہو کر پھر بازار جاں سپاری عشاق کو آب و تاب اور رونق دی ہے
اور جاں سپاری کا بازار گرم ہے۔

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں　　پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر اُسی بیوفا پر ہم اپنی جان دیتے ہیں پھر ہماری زندگی کا وہی طرز ہے۔

پھر کھلا ہے در عدالت ناز　　گرم بازار فوجداری ہے

عدالت ناز کے پھر اجلاس ہو رہے ہیں اور فوجداری کے مقدمات روزانہ دائر
ہوتے ہیں یا پیش ہوتے ہیں۔ یا فوجداری کی وارداتیں روز ہوتی ہیں۔

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر　　زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

آجکل زلف سرشتہ دار یعنی پیشکار ہے اور اُسکے ظلم و ستم سے جہان میں ایک اندھیر
ہو رہا ہے سرشتہ اور اندھیر وغیرہ یہ سب زلف کے مناسبات سے ہیں۔

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال　　ایک فریاد و آہ و زاری ہے

سوال دینا اصطلاح وکلاء و عدالت میں درخواست کو کہتے ہیں جو مقدمہ کے دائر
کرنے کے وقت دیتے ہیں۔ مقدمہ دائر کرنے والے یا درخواست دینے والے کو سائل
اور جب درخواست دیتے ہیں یا حکام درخواستیں لیتے ہیں اوس وقت کو سوال خوانی کا وقت کہتے ہیں
یعنی پارۂ دل نے پھر آہ و زاری و فریاد کے خلاف درخواست دی ہے۔ ایک فریاد یعنی کثیر فریاد

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب　　اشکباری کا حکم جاری ہے

اسی درخواست کے لیے گواہ عشق پھر طلب ہوئے ہیں۔ اور پھر اشکباری کا حکم جاری ہوا ہے
یعنی آنسو پھر طلب ہوئے ہیں۔

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　آج پھر اُسکی روبکاری ہے

دل اور مژگاں کی جو خصومت تھی آج پھر وہ مقدمہ پیش ہے۔

بے خودی بے سبب نہیں غالب　　کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

اگرچہ مقطع اس قطعے سے علیحدہ معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہ بھی اسی میں شامل ہے گویا
پوچھا گیا ہے کہ اگر تمکو مژگاں نے ستایا ہے۔ تو تم یہ بتاؤ کہ بیخود کیوں ہو معلوم ہوتا ہے
کہ تصور تمہارا ہے اور تم اسکو چھپاتے ہو۔ یعنی تمکو عشق ہے۔ اور یہی وجہ ہے تمکو بیخودی ہے
اور اس حالت میں مژگاں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگرچہ اس قطعہ میں جو الفاظ ہیں وہ اردو
کے ہیں مگر چونکہ وہ الفاظ زبان فارسی سے لیکر اپنے یہاں کے خاص خاص معنوں میں مستعمل
ہوئے گئے ہیں اسوجہ سے اونکی ترکیب فارسی الفاظ کے ساتھ ناجائز نہیں کہی جا سکتی۔
پھر کے لفظ سے یہ ثابت کیا ہے کہ ایسا اکثر مرتبہ ہو چکا ہے۔

جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی　　نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

اے جنوں چونکہ ہم نے کچھ خوشی کی ہے تو تجھ پر اس سے تسکین کی تہمت جو تیرے لیے
باعث ننگ ہے نہیں رکھی جا سکتی۔ بلکہ اگر ہم نے لذت زندگی کچھ اٹھائی ہے تو وہ ایسی
ہی ہے کہ کچھ دیر بعد جو وہ ہمسے چھن جائیگی یا ہم اسکو چھوڑ دینگے تو وہ اور بھی ہمارے
خراش دل کے لیے باعث نمک پاشی ہو جائیگی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو عیش فانی ہو۔ وہ اور
باعث تکلیف ہے۔
دوسرے یہ کہ اے جنوں تسکین کی تہمت میری شادمانی کرنے سے تجھ پر نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ
لذت زندگانی کو دیکھ کر میں اُن لذتوں سے خوش نہیں ہوتا جو اُس میں موجود ہیں بلکہ
دل میں حسرت کرتا ہوں کہ یہ مجھکو میسر نہیں ہیں۔ اور ان سے میرے دل پر نمک چھڑکا
جاتا ہے۔ اور یہ نمک پاشی میرے زخم دل کے لیے باعث شادمانی۔ اور اس

شادمانی سے تو تمہیں بشادمانی حقیقی نہیں ہوسکتا

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی — ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

کشاکش علائق ہستی سے سعی آزادی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ یعنی کوئی اس سے آزاد نہیں رہسکتا۔ جیسے کہ پانی جسکی روانی آزادی سے تعبیر کیجا سکتی۔ مگر اُسپر بھی زنجیرہائے تموج میں گرفتار رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ یہاں کی آزادی بھی گرفتاری ہے۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارتگاہ طفلاں ہے — شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

ترا دیوانہ مرنے کے بعد بھی لڑکوں کی زیارت گاہ بنا رہا۔ اور میری قبر پر پتھر مارتے رہے جن کے شراروں سے گویا میری قبر پر پھول چڑھائے۔

نکوہش ہے سزا فریادیٔ بیدادِ دلبر کی — مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

جو اپنے معشوق کی فریاد کرنے کا ارادہ کرے اگر اُسکو ملامت کیجائے تو بجا ہے اور یہی اوسکی سزا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح محشر خندہ دنداں نما ہو کیونکہ وہ فریاد اور عدالت کا دن ہے اسی مضمون کو مصنف نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے جیسا کہ ایک جگہ ہم لکھ چکے ہیں۔

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے — اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

یہ ایک مشہور قصہ ہے کہ فصد کھلی واں فصد لیلے کے یہاں مجنوں کے خون نکلا۔ اوسکی تلمیح کرکے مصنف نے یہ شعر لکھا ہے کہتا ہے کہ اتحاد حسن و عشق کی یہ تاثیر ہے کہ اگر دشت نجد میں دہقان بجائے دانہ کے نوک نشتر بوئے تو یقین ہے کہ لیلی کی رگ میں اوسکا اثر محسوس ہوگا کیونکہ وہ نوک نشتر مجنوں کے پاؤں کو زخمی کریگی۔ اِدھر اسکے خون نکلے گا اُدھر اُسکا جسم مجروح ہوگا۔ یا یہ کہ رابطہ حسن و عشق اسی کا نام ہے عاشق کی ادنے تکلیف معشوق کو اور معشوق کی عاشق کو محسوس ہوتی ہے۔ خاک دشت مجنوں کو مجنوں سے صرف اسقدر تعلق ہے کہ وہ اُسپر سے گذرتا ہے۔ مگر اُس خاک میں اگر دہقان نوک نشتر چھوڑے تو لیلے پر اُسکا اثر ہو پہنچیگا مولانا نظم لکھتے ہیں کہ ممکن ہے مصنف نے دست ہاتھ کے معنے میں لکھا ہو۔ مگر فائدہ

کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اُس سے لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ نہ لفظ خاک با معنی رہتا ہے

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا — ہوئی محفل کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

پروانہ کا پر شاید کشتی مے کے لئے بادبان تھا جو گرمی محفل کی دلیل تھا۔ اور محفل کی گرمی روانی دور ساغر کا باعث تھی تو اس صورت میں پر پروانہ بادبان کشتی مے ٹھہرا اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں محفل گرم ہوتی ہے وہاں پروانہ ضرور پہونچتا ہے اور اس صورت میں پروانہ گرمی محفل کی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ اپنی لزوم موجودگی سے وہ باعث گرمی محفل کے درجہ پر پہونچگیا ہے۔

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت — کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی طاقت اڑ گئی ہے جسنے مجھے مجبور کر دیا اور اب اڑ نہیں سکتا ہوں اسوجہ سے شوق پرفشانی کے وجہ بیداد مجھپر ہورہے ہیں کہ میں عرض نہیں کرسکتا۔

کہاں تک روؤں اوسکے خیمے کے پیچھے قیامت ہے — مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

اوسکے خیمہ کے پیچھے کہاں تک روئے جاؤں الہٰی میری قسمت میں کیا کوئی پتھر کی دیوار نہ تھی کہ اس میں اپنا سر پھوڑ کر مر رہتا اور اس رونے کی زحمت سے نجات پاتا۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

اپنی بے اعتدالیوں کے سبب سے سب کی نظروں میں ہم سبک ہو گئے ہیں یوں سمجھیے کہ جتنے ادھر بڑھتے گئے اسیقدر ہمارا وقار کم ہوتا گیا۔

یہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے — اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہمارے آشیانے کے بہت قریب ہی صیاد نے جال بچھا دیا۔ یہانتک کہ ہم اڑنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ جال میں پھنس گئے اور اُڑنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ایسا ہی کسی اور شاعر کا شعر ہے

صیاد نے کسوقت لگایا ہے نشانہ — جب اُڑنے کو ہم شاخ پہ پر تول رہے تھے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے — یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

ہماری ہستی تا ضرور ہے مگر وہ محض برائے نام ہے۔ مقدور اتنی ہے کہ ہم اپنی ہستی کی قسم کھا سکتے ہیں یعنی بس قسم کھانے کے لئے باقی ہیں ورنہ بالکل فنا ہو چکے۔

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر — وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

جو لوگ مدتوں عشق کی سختیاں کھینچتے رہے ہیں وہ سراپا الم بن گئے اور اب انکا وجود بالکل غیر مرئی اور نا محسوس ہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

خون کی حکایات خونچکاں لکھتے ہیں اگرچہ ہمارے ہاتھ تک قلم ہو گئے مگر ہم لکھتے ضرور رہے یعنی ان حکایتوں کا لکھنا ہمکو اسقدر پیارا تھا کہ ہاتھ قلم ہونے منظور کئے مگر یہ منظور نہ کیا کہ ہم یہ حکایات نہ لکھیں۔ اور یہ بھی ایک جنون ہے۔

اللہ رے تیری تندئ خو جس کے بیم سے — اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اللہ ری بدمزاجی اور تندی خو جس کی دہشت اور خوف سے میرے نالہ کے اجزا دل کے دل ہی میں تحلیل ہو گئے اور ایک دوسرے کے رزق بن گئے۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق — جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح یہی ہے کہ وہ میدانِ عشق سے بھاگ جائیں اور انکے جو پاؤں اٹھ گئے گویا وہی ان کے علمِ فتح بلند ہوئے ہیں۔ پاؤں اٹھنا محاورہ ہے جو بھاگنے کے معنے میں ہے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

عدم میں چند نالے کھینچنے کیلئے ہمارے سپرد ہوئے تھے جو ہم وہاں ختم نہ کر سکے اور نہ کھینچ سکے اور وہاں کے رہنے کی مدت ختم ہو گئی وہ یہاں بہ صورت نفس تبدیل ہو گئے۔ حاصل یہ ہے کہ ہماری

زندگی محض نالہ کشی کے لئے ہے۔ اور یہ جسکو لوگ سانس سمجھے ہوئے ہیں سانس نہیں ہیں بلکہ نالے ہیں۔

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی — سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

عاشقی اور دل لگی کی عادت ان برے حالوں یعنی فقیری میں بھی نہ چھوڑی۔ ہم فقیر ہوئے تو اہل کرم کے عاشق ہوئے اور انکی تلاش میں مارے مارے پھرے۔

بدلکر فقیروں کا ہم بھیس غالب — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی — تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

اگر میرے داغِ دل کی شعلہ سوز عشق حفاظت نہ کرے تو افسردگی اس زر داغ کو اڑا لیجائے کہ وہ اسکی گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ یعنی ہم وہ بدنصیب ہیں کہ کسی صورت سے ہمارے آرام کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر داغِ دل کی چمک دمک باقی نہ رہے تو افسردگی پیدا ہو جائے اور یہ ظاہر ہے کہ جیسی وہ بری ہے ویسی ہی یہ بری ہے یعنی افسردگی و جلا و داغ عشق دونوں یکساں ہیں۔ مولانا نظم لکھتے ہیں کہ تشبیہیں لطیف ہیں حاصل شعر کا کچھ بھی نہیں ہے حالانکہ مصنف نے مضمون آفرینی کی ہے اور نہایت اچھا حاصل نکالا ہے۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی — کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

میں ایسے شخص سے کیونکر یہ امید رکھوں کہ جوانی ہو کر وہ میرے دل کی تمنائیں پوری کریگا جسنے کبھی بچپن میں میری کہانی بھی نہ سنی حالانکہ بچپن کے زمانہ میں کہانی سننے کا سب بچوں کو شوق ہوتا ہے۔

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا — کہ مرے عدو کو یا رب ملے میری زندگانی

بلاوجہ کسیکو دکھ دینا کچھ اچھا نہیں ہے ورنہ یہ دعا مانگا کرتا کہ یا خدا میری زندگی میرے دشمن کو دیدے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر اسکو میری زندگی ملتی تو وہ بھی بلاؤں میں پھنس جاتا۔ ایک جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔ یہاں زندگی نہ دینے کی وجہ بلاوجہ کسی کو ستانا رکھا مگر وہاں دوسرا سبب ہے۔

ے دریغا از حسرت دیدہ ور نہ جائے آں وارد — کہ بے رویت بہ شمن جادہ با شم زندگانی را

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

میرے ظلمت کدے میں شب غم کا جوش ہے یعنی ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے اور صبح کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے بلکہ کوئی ایسی شے بھی نہیں ہے جس سے صبح پیدا ہونے کے کچھ آثار ظاہر ہوں اگر ہے تو شمع جو بجھی ہوئی ہے وہ دلیل سحر ہے کیونکہ شمع صبح کے وقت بجھ جایا کرتی ہے سو وہ خاموش ہے۔ پھر خیال کیجیے کہ جہاں دلیل سحر بھی موید معین تاریکی ہو اس گھر کی تاریکی کی کیا حد ہے اسی مضمون کے دو شعر لکھے جا چکے ہیں ذوق مرحوم کہتے ہیں

ے دود دل سے ہے یہ تاریکی مرے غمخانے میں — شمع ہے اک سوزن گم گشتہ ہی شانے میں
مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند — شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

نہ مدت سے کوئی وصال کی خوشخبری سنی اور نہ اس کا جمال آنکھوں سے دیکھا۔ گویا آجکل کان اور آنکھ کی صلح ہو گئی ہے نہ اسکو اس پر رشک کا موقع ہے نہ اس کو اس پر ورنہ ایک زمانہ میں کبھی جمال دیکھتے تھے کبھی مژدہ وصال سنتے تھے۔ اور آنکھ کان سے کان آنکھ سے دشمنی رکھتا تھا۔ بلکہ اسی مضمون کا شعر ناسخ کا ہے مگر حق یہ ہے کہ غالب مرحوم نے اس صفائی سے اسکو نظم کیا ہے کہ ناسخ کے یہاں اس کا نام بھی نہیں ہے۔

ناسخ — شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی — برسوں ہوئے کہ ایک سی حالت چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب — اے شوق یاں اجازت تسلیم ہوش ہے

حسن خود آرا کو مے نے بے حجاب کر دیا ہے اے شوق اس وقت اجازت ہے کہ اپنے ہوش و حواس اسکے حوالہ کر دے یعنی تو بھی بیخود ہو جا۔

گوہر کو عقد گردن خوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

موتی معشوقوں کے ہار تک پہونچا ہے ذرا ستارۂ جوہری کا اوج اور بلندی دیکھنا کہ

یوں کہا ہے ے تیرے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں — ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں
ذرا سے فرق سے دونوں مضامین میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست — بزم خیال میکدۂ بے خروش ہے

ہماری بزم خیال ایک ایسا میخانہ ہے جسمیں شور و شر کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ یہاں دیدار شراب ہے حوصلہ ساقی ہے کہ ہر ایک کے اندازہ کے موافق اسکو شراب پلاتا ہے۔ نگاہ ایک مست بیہوش ہے کہ بہتی چلی جاتی ہے مصرع اولی میں اضافت نہیں ہے۔

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے

اے وہ لوگو کہ فرش خواہش دل پر ابھی ابھی آکر بیٹھے ہو اور اس بزم میں تو وارد ہو۔ ذرا خبردار ہو اگر تمہیں نغمہ و سرود اور شراب نوشی کی تمنا ہے۔ یہ نوجوانوں سے خطاب ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

تم اپنے ارادوں کو پورا کرنا مگر جو تمہاری آنکھ میں نگاہ عبرت موجود ہے۔ اور اگر تمہارے کان میں نصیحت سننے کا مادہ اور قابلیت ہے۔ تو مجھے دیکھو۔ اور میری نصیحت سنو۔

ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی — مطرب بنغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

ساقی کو نہ دیکھو اسکا جلوہ ایمان و عقل کا دشمن ہے مطرب کے نغمہ نہ سنو یہ تمکین و ہوش کے رہزن ہیں مہر کر دیکھتے ہیں سو خلوت دل میں کر دیا اپنے حواس میں خلل چمن بلائے چشم ہے نغمہ وبال گوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامان باغبان و کف گلفروش ہے

تم نے شب کو بھی بزم کی حالت دیکھی ہوگی کہ ہر گوشہ بساط پر پھولوں کا انبار تھا جس سے فرش انجمن باغبان کا دامن اور گلفروش کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا۔

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ — یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

خرام ناز ساقی کے دیکھنے اور چنگ کی مستانہ آواز سے نگاہ اور کانوں کو جنت کا مزہ آرہا تھا

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

رات یہ کیفیت تھی مگر صبح کے وقت جو آکر دیکھا نہ وہ خوشی کا عالم ہے نہ وہ چہل پہل ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اب بجائے اوس خوشی کے سامان کے ایک شمع خاموش محفل میں نظر آتی ہے جسکو صحبت شب کی جدائی کے داغ نے جلا دیا ہے اور وہ چپ بیٹھی ہوئی ہے۔
مصنف نے ان قطعہ میں سحر نگاری کی ہے۔ جواب نہیں ہوسکتا۔ بزم کے سرور کی بھی کیفیت دو شعر و نمیں دکھا دی ہے اور رنج و غم کا بھی فوٹو کھینچ دیا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

یہ مضامین جو میں لکھتا ہوں یہ سب غیب سے میرے خیال میں آتے ہیں اور گویا خامہ کی صریر فرشتہ غیب کی آواز ہے۔ صریر خامہ کو نوائے سروش سے تشبیہ دینا لطف سے خالی نہیں ہے سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

اب تو جلد آ اور میری خبر لے کہ میری جان اتنی بیقرار ہو گئی ہے کہ مجھ میں تاب انتظار باقی نہیں رہی ہے۔

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے — نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

ظاہر ہے کہ جنت حیات دہر کے بعد ملیگی۔ مگر مصنف کہتا ہے کہ اگرچہ انقضائے زمانہ زندگی کے بعد لوگوں کو جنت دیجاتی ہے۔ مگر دل تعریہ ہے کہ اس خمار کے مقابلہ میں وہ شراب بہت کم ہے یعنی یہاں جسقدر تکالیف کا سامنا ہوا ہے اوس کی اس عیش آیندہ سے تسلی نہیں ہوسکتی

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو — ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

نالہ و فریاد مجھے تیری بزم سے نکالتی ہے۔ ہائے افسوس کہ رونے پر مجھکو اختیار نہیں رہا۔ یعنی ضبط کی طاقت مجھ میں باقی نہیں ہے۔

ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر — خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

ہمارے مرجانے پر تو خیال کرتا ہے کہ یہ رنجیدہ ہو گیا یہ گمان غلط ہے۔ ہماری خاک میں رنج وغیرہ کا بالکل نام و نشان بھی نہیں ہے۔ لہذا یہ خیال فضول ہے۔ خاک اور غبار کا تناسب خوب ہے

دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی — غیر گل آئینۂ بہار نہیں ہے

اگر معانی کا لطف حاصل کرنا چاہتا ہے تو دل سے حاصل کر۔ کیونکہ بہار کا مزا بغیر آئینہ گل کے نہیں آسکتا یعنی گل ایک آئینہ ہے جس میں گل کی تصویر نظر آتی ہے اسی صورت سے دل آئینہ جسمیں شاہدان معانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے — وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

خیر خدا کا شکر ہے کہ اسنے میرے قتل کرنے کا عہد تو کرلیا ہے مگر جو اور پیمانوں کی طرح یہ پیمان بھی بودا ہے تو افسوس ہے۔ نہایت خوب شعر ہے۔

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب — تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

تو نے غالب مے نوشی سے قسم تو ضرور کھائی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے آج تو بکی ہے کل توڑ دے گا۔

ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے — کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

غم کے بوجھ کی کثرت سے میری گردن اسقدر جھکی ہوئی ہے کہ میرے دامن اور نظر کے تار کا فرق معلوم کرنا بہت دشوار ہے۔ یعنی دونوں مل رہے ہیں۔

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی — سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

زخم کو رفو کرانے سے یہ مطلب ہے کہ سوئی سے جو تازہ زخم ہوں اُنکی بھی لذت اٹھاؤں۔ کہیں اس رفو کا یہ مطلب نہ سمجھنا کہ دیوانہ کو اب درد کا خیال نہیں رہا۔ اسی مضمون کا شعر گذر چکا ہے۔

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب — چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

وہ گل جس باغ میں جائے وہاں غنچہ کے چٹکنے کو خندۂ دل کی صدا سمجھنا چاہیے جس سے باغ کی خوشی کا پتہ چلتا ہے۔ گل خاص گلاب کے پھول کو کہتے ہیں۔ اور اسکی کلی دل سے مشابہ ہے۔ اس کے چٹکنے کو شعراء خندہ اور گریہ دونوں سے استعارہ کرتے ہیں۔

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد — خار پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے

میں صحرا نورد تھا اور اب پاؤں میں کانٹے چبھنے سے تھک کر بیٹھ گیا ہوں تو خار پا میرے واسطے آئینہ زانو بن گئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ زانو کو شعراء آئینہ سے استعارہ کرتے ہیں۔ لطیف بات اسمیں یہ ہے کہ میرے پاؤں میں ایسے کانٹے چبھے ہیں جنکا اثر زانو تک محسوس ہو رہا ہے یہاں زانو کو آئینہ سے استعارہ خاص اسوجہ سے کیا گیا ہے جس سے سرنگونی کا پتہ چلے۔

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت — ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

میرے دل کی حالت کا ہم آغوشی کے وقت اندازہ کرنا کیونکہ تیرا بال بال میرے دل سے آشنا ہے کیونکہ دل مدتوں تیری زلف میں اسیر رہ چکا ہے اسوجہ سے ہر ایک سر مو ہم آغوشی کے وقت نگاہ آشنا کا کام دے گا۔

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ — ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

میں یک ایسا باجہ ہوں جسمیں شکایتوں کا راگ بھرا ہوا ہے مناسب یہی ہے کہ لوگوں میں تو مجھکو نہ چھیڑے۔ ورنہ معلوم نہیں کہ میری زبان سے کیا کیا نکل جائے گا اسی مضمون کا دوسرا

شعر مرزا نے لکھا ہے ؎

پردوں میں شکوہ کرتی ہے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ہیں سرود و نغمہ جانسوز مجذوبان عشق — چھیڑ دے اور چھیڑ کر اک دل لگی دیکھا کر

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

تو جس محفل میں ناز سے باتیں کرے۔ تو چونکہ تیری باتیں معجز نما ہیں اور انمیں جان بخشی کا اثر ہے اس لئے وہ کالبد جو صورت دیوار یعنی بالکل مردہ ہیں اونمیں جان آجائے تو تعجب نہیں ہے۔

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

اگر تیرا قد دلکش باغ میں آئے تو سرو و صنوبر غایت عشق سے تیرے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ پھریں۔

تب ناز گرانمایگی اشک بجا ہے — جب لخت جگر دیدۂ خونبار میں آوے

اشک اوس حالت میں اپنی گراں مایگی پر جتنا چاہیں ناز کریں جب دیدۂ خونبار میں لخت جگر آئے۔

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اے ظالم تو مجھے شکایت کی اجازت دے کہ ذرا تجھے میرے ستانے میں لطف آئے۔ بیوجہ ستانے میں کوئی لطف نہیں ہے یعنی تو مجھپر ظلم کرے اور میں تیری شکایت کروں تو اور بھی تو مجھپر ستم کرے اس شعر میں حد عاشقی کا انتہا سے زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ یعنی عاشق چاہتا ہے کہ معشوق کا جی خوش ہو اپنی تکلیف کا کوئی خیال نہیں ہے دیکھئے ایک جگہ رونیکی اجازت اس لئے حاصل کی ہے۔

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم — تیرے چہرہ سے عیاں ہو غم پنہاں میرا

اس چشم فسونگر کا اگر پائے اشارا — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

اگر وہ چشم فسونگر اشارا کردے تو آئینہ طوطی خوش گفتار کی طرح باتیں کرنے لگے۔ کیونکہ اوسکی آنکھ کا اشارہ سحر کا مرتبہ رکھتا ہے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ایک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

ایجاد کانٹوں نے پیاس کے مارے زبانیں نکالدی ہیں اور انکی زبانیں خشک ہو رہی ہیں ایسے میں کسی آبلہ پا کو بھیجدے کہ ان کی پیاس بجھے۔ در پردہ قید سے اپنی رہائی کی دعا ہے۔

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

میں رشک سے کیونکر نہ مروں جب اسکے جسم نازک کو حلقۂ زنار اپنی آغوش میں لے حسب عادت شعراء مصنف نے اپنے معشوق کو ہندو قرار دیا ہے۔

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

گر حرص زر غارت گر ناموس نہو تو پھول اپنے وطن یعنی باغ سے نکل کر بازار میں کیوں آ کے اپنی عزت کو برباد کرے یعنی پھول کو باغ سے بازار میں زر حاصل کرنے کے لئے لاتے ہیں اور اس وجہ سے گل غارت گر ناموس ہے۔ مولانا نظم اسکا یہ مطلب نکالتے ہیں کہ گلاب کا کھلنا اور زرِ گل کا کھلنا گویا زر کی ہوس میں ہاتھ پھیلانا ہے جس کا انجام یہ ہوا کہ سر بازار آنا پڑا نہیں تو بربادیٔ ناموس کا کیوں سامنا ہوتا۔ غنچہ کی طرح بند ہی مٹھی چلا گیا ہوتا جب ہاتھ پھیلا کر زر لیا تو شاہد بازاری ہو گیا اور ناموس عزت برباد گئی۔

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ ناداں جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

اے دل چاک گریبان کا لطف جب ہے کہ جب تار نفس بھی اسی تار گریبان میں الجھا ہوا آئے یعنی تار نفس کا بھی تار گریبان کے ساتھ خاتمہ ہو۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

میرے سینہ کو راز نہان عشق نے آتش کدہ بنا رکھا ہے اور میں اس سے پھنکا جاتا ہوں افسوس ہے کہ اگر وہ راز کھل جائے تو دنیا کو پھونک دے گا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

اے غالب جو لفظ میرے شعر میں آئیں وہ خزانہ معنی کے طلسم ہیں یعنی میرے شعر کا ہر ایک لفظ کثیر المعنی ہے جس سے عجیب عجیب معانی پیدا ہوتے ہیں۔

حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

ہم اسکو مانتے ہیں کہ چودھویں کے چاند کا حسن اچھا ہے مگر میرا معشوق خورشید جمال اس سے بہت اچھا ہے اسلئے کہ از مہر تا بہ ماہ۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

بوسہ جو دل کی قیمت ہے اسکے دینے میں تو لیت و لعل کرتے ہیں اور دل کو تاکتے رہتے ہیں جی میں کہہ رہا ہوگا کہ اگر مفت ملجائے تو مال اچھا ہے۔

اور بازار سے لے آئیں گے گر ٹوٹ گیا ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

یعنی ایسی چیز کی کیوں جستجو کیجائے جسکی جستجو کی تکلیف اسکی عیش سے زیادہ ہو ساغر جم کو کیوں ڈھونڈھیں

ع ہم اپنی خشک مٹی بے بگھاری دال کے صدقے
ہمارا مٹی کا پیالہ اس سے اچھا ہے اگر ٹوٹ جائے تو حرج نہیں دوبارہ بازار سے مل سکتا ہے اور وہ خراب ہونے ٹوٹنے پھوٹنے کے بعد کہیں میسر نہیں ہو سکتا۔ بعض نسخوں میں پہلا مصرع یوں ہے ع اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا۔ مضمون دونوں کا ایک ہے اسی مضمون کا منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کا شعر ہے جسمیں زبان کی شوخی کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا ہے انصاف یہ ہے کہ منشی صاحب کا شعر اس سے کم نہیں ہے۔

ع ساغرِ جم ہی پہ موقوف نہیں بادہ کشی ٹوٹا پھوٹا کوئی مٹی کا پیالا ہوتا۔

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان دونوں مصرعوں میں تقابل سائل و مسؤل عنہ کیا گیا ہے۔ یعنی جو لوگ بغیر مانگے بھیک

دیدیتے ہیں اوسمیں اُن کو اُس سے زیادہ مزا آتا ہے کہ مانگنے سے سائل کو کچھ دیں۔ ایسے ہی وہ فقیر جنّے مانگنے کی عادت نہو مانگنے والے سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ مطلب یہ کہ سائل کو سوال اور تو نگر کو انتظار سوال نہ کرنا چاہیئے۔

نظم صاحب اسکا مطلب یہ لکھتے ہیں کہ مانگنے سے ملا تو کیا رہ گئی جو قسمت میں ہے، وہ ملے گا ضرور اگر بے سوال ملا تو کیا پوچھنا اوس ملنے سے کیسا دل خوش ہوجاتا ہے۔ سوال کی مذمت کیا اچھی طرح سے کی ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اُسمیں اپنی بدقسمتی کا اظہار مقصود ہے کہ جب وہ رحم کھاکر میرا حال زار دیکھنے لئے آتے ہیں تو میرا چہرہ بحال ہوجاتا ہے۔ اور اس حالت میں وہ میرے درد و غم کو محض بناوٹ سمجھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ یہ مضمون نہایت لطیف ہے اور خوب لکھا ہے۔ فارسی کا ایک شعر اسی مضمون کا ہے۔

ے باوجو میر سم آسودہ میشوم از دور — ندیدہ حال مرا وقت بیقراری حیف

ے مرے دل کے دھڑکنے کا اُنھیں کیونکر یقیں آئے — ٹھہر جاتا ہے دل جب ہاتھ وہ سینہ پر دھر لیتے ہیں

غالب کا یہ قافیہ نہایت مقبول ہے۔ اور اس شعر کو عوام نے بیت الغزل مان لیا ہے۔ مرزا داغ نے اس قافیہ کو خوب لکھا ہے سلاست زبان نے چار چاند لگا دئے ہیں۔

ے آپ پچھتائیں نہیں ظلم سے توبہ نہ کریں — آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض — اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا عاشق اپنے زعم میں نفع نقصان دنیا کو محض معشوقوں کی جفا دفا تک محدود سمجھتا ہے اسی بنا پر کہتا ہے کہ دیکھئے ایک نجومی نے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ یہ سال اچھا ہے اب دیکھئے بتوں یعنی معشوقوں سے عاشقوں کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ یہ ہرا تو کچھ بھی نہیں۔

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا — جسطرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

مصنف دعوے کرتا ہے کہ کمال جیسا بھی ہو وہ اچھا ہے اور اسکے ثبوت میں فرہاد کا مشہور فن اور قصّہ پیش کرتا ہے کہ دیکھو فرہاد کا شیریں سے ہمکلام ہونا سخت دشوار تھا۔ مگر تیشہ نے

اوسکو اُس سے ہمکلام کرایا۔ یعنی اوسکو کوہکنی میں کمال تھا۔ اور کوہکنی کے لئے تیشہ ضرور چاہیئے۔ لہذا کمال کسی شے کا کیوں نہ ہو وہ اچھا ہے۔

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی — کس بے کمال ہیچ نیرزد عزیز من

مولانا نظم نے اس شعر میں تین نقص نکالے ہیں۔ پہلے مصرع کو گنجلک۔ دوسرے میں تنافر تیسرے مضمون کچھ نہیں۔ اور یہی اسکی شرح کی ہے۔ تنافر بعض حروف کے یکجا جمع ہونے سے ہوتا ہے مگر مسلّم تنافر کا یہ کلیہ ہے کہ جو طبیعت پر گراں گذرے وہی تنافر ہے ورنہ کچھ نہیں۔ جیسے کہ تین چار اضافتیں متواتر جمع ہونا بُرا ہے مگر بعض جگہ کثرت اضافت لطف دیجاتی ہے۔ معانی شعر میں جیسے بیان کئے جو اخلاقی ہیں۔ نہ پہلے مصرعہ میں کوئی زیادہ گنجلگ معلوم ہوتی ہے کہ سمجھنے والا نہ سمجھ سکے

قطرہ دریا میں جو ملجائے تو دریا ہوجائے — کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

اسمیں بھی مصنف نے ایک اخلاقی سبق دیا ہے۔ یعنی جو کام کہ اُس کا مآل اچھا ہو وہ اچھا ہے جیسے کہ قطرہ خود کو دریا میں ملکر مٹاتا ہے مگر اوسکا انجام اچھا ہوتا ہے کہ دریا بنجاتا ہے۔

ے عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سر سبز — شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

خضر سلطان نام ہے فرزند بہادر شاہ ظفر مرحوم کا اوسکی مدح میں یہ شعر ہے۔ تازہ نہال سے نوجوانی مقصود ہے اس شعر میں خضر۔ سرسبز باغ تازہ نہال وغیرہ الفاظ مناسب ہیں جو بحسن و خوبی نظم ہوگئے ہیں یا کئے گئے ہیں۔

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالب جنت کی حقیقت ہمکو معلوم ہے۔ اور وہ صرف اتنی ہی ہے کہ اس سے دل خوش رہتا ہے۔ یعنی جنت محض اک سبز باغ ہے جو اکثر زاہد دکھاتے ہیں۔ فارسی میں اس مضمونکو یوں فرماتے ہیں۔

ے فردوس جوئے عمر تو ہوا سن ادہ آہ — سرمایہ نیز در سر این سود میبرد

ے غالب خجسۃ فرصت عمر موہوم دفکر عیش — تارے کہ نیست در سر این بود میبرد

نہوئی گر مرے مرنیسے تسلی نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

بمثل شعر کہا ہے کہ اے ظالم اگر میرے مرجانے سے تیری تسلی نہوئی اور تو ہنوز اور امتحان کی فکر میں ہے تو میں بھی خوش ہوں خوشی سے اور امتحان سے میں تیار ہوں۔ ایک شاعر مرنے کے بعد اپنی تباہی کا یوں اظہار کرتا ہے۔

فلک را کار باقی ہست با مشت غبار من — کہ بازی گاہ طفلاں میکند خاک مزار من

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے — شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

اگر میرے شوق کو گلچینی گلستان تسلی حاصل نہیں ہے تو یہ کیا کم ہے کہ خار زار حسرت دیدار کو مصرف ہے بہر حال کچھ نہ کچھ ہو ضرور سے حالی۔

یارب طرب وصل ہو یا ہو طلب وصل — جس دن کہ یہ دونوں نہوں وہ دن نہ دکھانا

مے پرستاں خم مے منہ سے لگائے ہی بنے — ایک دن گر نہوا بزم میں ساقی نہ سہی

اے میکشو ساقی ہوتا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ وہ جام بھر بھر کر پلاتا۔ اب ساقی نہیں ہے تو خم مے منہ سے لگا کر آپ پی لو۔ ایک دن ساقی نہ ہوا نہ سہی مطلب پینے اور جی بھر کر پینے سے ہے

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا — گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

آہ شعلہ بار قیس سے چشم و چراغ صحرا روشن ہو رہے ہیں۔ اگر یہ شمع سیہ خانہ لیلیٰ میں نہیں ہے نہ سہی۔ لیلیٰ چونکہ رات کو کہتے ہیں اور لیلیٰ سیہ فام تھی اسواسطے سیہ خانہ کہا گیا یعنی اسکے سیہ خانہ دل کے لیے یہ شمع نورانی کام نہیں دیتی تو نہ دے کچھ پرواہ نہیں ہے جنگل تو اس سے آراستہ ہوگیا ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

یہ شعر بہت خوب کہا ہے۔ یعنی گھر میں ایک ہنگامہ ہونیسے گھر کی رونق ہوتی ہے اگر نغمہ شادی نہو تو نوحہ غم میں بھی ایک شان نکلتی ہے۔ یہ کمال مجبوری عاشق کا خیال ہے۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

نہ کسی سے داد ملنے کی پروا ہے نہ صلہ و انعام کی خواہش ہے۔ لوگ میرے اشعار کو بے معنی قرار دیتے ہیں تو دیں اور کوئی مجھے دیتا ہو تو نہ دے۔

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو — نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

غالب اگرچہ صدمہائے عشق و محبت نے تم کو عمر طبیعی تک نہ پہونچنے دیا۔ مگر خیر نہ سہی یہ کیا کچھ کم ہے کہ جسقدر عمر ہوئی وہ معشوقوں کی صحبت میں بسر ہوئی۔ طبعی۔ اور طبیعی دونوں ایک معنے میں مستعمل ہیں۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے — کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

یہ عجب خوشی ہے کہ ہم جلاد کے آگے جا رہے ہیں۔ کہ سایہ کیوجہ سے ہمارا پاؤں سے دو قدم آگے ہے اور اس سے ہماری خوشی قتل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت — فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

روز ازل کاتب تقدیر نے چاہا تھا کہ خراب بادہ الفت مجھے لکھدے۔ لیکن صرف خراب لکھا تھا کہ آگے قلم نہ اوٹھ سکا۔ لہذا اب میری خرابی کو خرابی الفت کوئی نہیں سمجھتا۔ صرف خراب و سرگشتہ سمجھتے ہیں۔

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی — وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذت الم آگے

زمانہ کے غموں نے سب ہمارا نشہ ہرن کر دیا۔ وگرنہ عشق میں جو ہمکو رنج ہوتے تھے ان سے حصول لذت کرتے تھے مگر غم زمانہ نے سب بھلا دیا۔

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا — کہ اسکے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

خدا کے لیے کوئی ہمارے اس شوق کی جسنے ہمکو مجنون بنا دیا ہے داد دیتا کہ ادھر نامہ بر کو

خط دیتے ہیں ادھر جواب کے شوق میں اسکے دروازہ پر نامہ بر سے پہلے جا پہونچتے ہیں۔ مضمون شعر شعر نہایت اچھا ہے لیکن وزن شعر نامانوس ہے اس وجہ سے لوگوں کی توجہ اس طرف نہیں ہوتی۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے — تمہارے آئیو اے طرۂ ہائے خم بخم آگے

یہ ساری عمر جو تمہارے ہاتھوں سے ہم نے پریشانیاں اٹھائی ہیں خدا کرے اے گیسوے خمدار تیرے آگے بھی آئے۔ آگے آنا۔ نتیجہ اٹھانا۔ بدلہ پانا۔

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے — ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

ہم دل و جگر میں یہ سمجھے تھے کہ موج خوں خوش زن ہے بلکہ سانس سمجھتے تھے اب معلوم ہوا کہ یہ موج خون تھی جسے غم عشق نے لہو بنا کر بہا دیا۔ اور وہ دل و جگر کا خون ہے۔ سانس نہیں ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ خون کی روانی وغیرہ سے انسانی زندگی ہے۔ اور سانس بھی اسکا کرشمہ ہے۔ ہر چند کہ سانس کا مقام پھیپھڑا ہے مگر شاعروں کے یہاں سب کام قلب و جگر و سینہ سے لیا جاتا ہے۔

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب — ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

اللہ اللہ زمانہ کا کیا انقلاب ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ وہ میری جان کی قسم کھاتے تھے اور ایک آج یہ وقت ہے کہ وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم بھی اسکے جنازہ پر حاضر نہ آئینگے۔ یا آج انھیں جنازہ پر آنے سے انکار ہے۔

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے — یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

شکوہ کا اگر نام بھی لیتا ہوں تو وہ بے وفا خفا ہو جاتا ہے بلکہ اتنی بات کے کہنے سے بھی گلا کرتا ہے یا یہ کہ یہ بھی جو میں کہتا ہوں تو یہ بھی گلہ سمجھا جاتا ہے مضمون شعر اور بندش نہایت چست ہے۔ اسی مضمون کو غالب کے شاگرد رشید جناب سخن دہلوی نے کہا ہے

یوں کسی پر کوئی سرگرم جفا ہوتا ہے — پھر کچھ اے یار جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ابھی دو غزلوں پہلے میں اس مضمون کا شعر گذر چکا ہے۔ کہتا ہے کہ میں شکووں سے ایسا بھرا ہوا ہوں جیسے راگ سے باجا بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اک ذرا چھیڑ دیجئے پھر مزا دیکھئے۔

مصحفی: نہ شیشہ ہے کسطرح اے ساقی — چھیڑ ندامت کو بھرے بیٹھے ہیں

گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو — شکوہ کے نام سے سرگرم جفا ہوتا ہے

اگرچہ میرے شکوے کو وہ کم سنی یا نہ سننے کی وجہ سے سمجھتے نہیں ہیں۔ مگر اسکی تلافی اس صورت کرتے ہیں کہ جفائیں کرنے لگتے ہیں بقول مومن

تم اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی وہ چال — سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

مکوکب یعنی کوکب دار۔ عشق کی راہ میں کم بخت آسمان کی ایسی سست چال ہے جیسے اس کے پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں۔ ستاروں کو چھالے قرار دیا ہے۔ اور سست روی اس سے ثابت کی ہے سست رفتار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آسمان کی گردش سے رات دن ہوتے ہیں۔ مگر جدائی کے دن اور راتیں پہاڑ سی ہوتی ہیں اور درازی کیوجہ سے انکا کاٹنا دشوار ہوتا ہے۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم — آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

آخر ہم ظلم و ستم کیوں نہ سہیں۔ اگر ہمیں سفاک کا کوئی تیر خطا ہوتا ہے تو ہم خود اسکو اٹھا کر لا دیتے ہیں کہ لے پھر ہمارے دل پر لگا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

تا منفعل ز رنجش بیجا نہ بینمش — مے آرم اعتراف گناہ نبودہ را

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ — کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

اگر پہلے سے ہم اپنے بدخواہ ہوتے تو بڑا اچھا تھا۔ کہ اپنا بھلا چاہتے ہیں تو برا ہوتا ہے۔ برا چاہتے تو بھلا ہوتا۔

مومن: مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

پہلے میرے نالے کی یہ کیفیت تھی کہ عرش تک جاتا تھا۔ مگر اب یہ زمانہ ہے کہ جو بڑا رسا ہوتا ہے وہ لب تک آتا ہے۔ یعنی اب حد سے زیادہ ضعیف ہو گیا ہوں نالہ تک۔

ع وائے اے ضعف کہ سنتے تھے فرشتے اکثر
یا سنائی نہیں دیتی مری فریاد مجھے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربد بزم سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

غزل لکھتے لکھتے قطعہ لکھدیا ہے۔ کہتے ہیں میرا قلم کہ وہ بزم سخن کے لئے ایک باربد ہے بادشاہ کی یوں مدح سرائی کرتا ہے۔ باربد ایک گویے کا نام ہے۔ جو اپنے فن میں نہایت کامل تھا۔

اے شہنشاہ کواکب سپہ و مہر علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

اے وہ بادشاہ کہ ستارے تیری سپاہ اور آفتاب تیرا علم ہے جیسا تو بزرگ ہے ویسا کون بیان کر سکتا ہے۔

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

اگر ساتوں ولایتوں کا محصول فراہم کریں تو وہ تیرے لشکر کے نعل کی قیمت ہے۔

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

چاند جو ہر مہینہ میں گھٹ کر بدر سے ہلال ہو جاتا ہے اسی وجہ سے ہے کہ تیرے آستانہ پر پیشانی گھستے گھستے اسکا یہ حال ہوتا ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

میں جو گستاخانہ اور بے تکلفانہ اچھی اچھی غزلیں پڑھتا ہوں اسکی کوئی اور وجہ نہیں ہے بلکہ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اے غالب میرے رونے اور شور و فغاں کو معاف رکھ اگر نالوں سے تو بدمزہ ہوتا ہے۔ آج درد دل کچھ بڑھ گیا ہے جس سے میں اس تلخ نوائی پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اور مجھ سے اور دنوں کی طرح ضبط نہیں ہو سکتا۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

آپ جو ہر ہر بات پر مجھے فرماتے ہیں کہ تو ہے کیا چیز۔ ذرا معاف فرمائیے آپ نے یہ کیا گفتگو کا طرز و طریقہ اختیار کیا ہے۔

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

تند خوئی کے سبب میں خیال کرتا تھا کہ وہ شعلہ ہوگا۔ مگر دیکھا کہ شعلہ میں یہ کرشمے نہیں ہیں تو میں نے شوخی دیکھکر یہ رائے قایم کی کہ وہ برق ہے مگر دیکھتا ہوں تو اس میں وہ ادائیں نہیں جو اس تند خو میں لہذا اس خیال کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا اللہ کوئی کچھ بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کون ہے۔ اور اسے میں کیا کہوں۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے

مجھے اس بات کی مطلق فکر نہیں ہے کہ دشمن تمہیں پٹیاں پڑھاتا ہے۔ مگر اسکا رشک ضرور ہے کہ وہ تم سے باتیں کرتا ہے۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

کوئی ہماری جیب و گریبان کے رفو کی کیوں فکر کرے ہمارا پیراہن لہو سے بدن پر چپکا ہوا یہی کافی ہے فارسی میں یوں کہا ہے ؎

بہ تن چسپیدہ بادم از نم خونابہ پیراہن
خراش سینہ سطر بخیہ شد چاک گریباں را

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

وہ ری نادانی کہ میرا جسم جلا دیا ہے اور دل کو ابھی ڈھونڈھ رہے ہیں اور خاک میں ڈھونڈھ رہے ہیں کہ وہ بھی جلا ہوگا۔ کیا شیوہ نادانی ہے ارے آخر یہ زحمت بیجا کیوں اٹھا رہے ہو جہاں جسم جلا ہے دل بھی جل گیا ہوگا۔ جناب نظم لکھتے ہیں کہ کریدنا برا ہے۔ کیا شعر مہمل تھا۔ مگر کہنا بہت اچھا ہے بجائے اسکے اس محل پر کوئی دوسرا لفظ رکھا جائے تو حقیقت کھلے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

وہ چیز جس کی وجہ سے ہم کو بہشت کی تمنا ہو شراب کے سوا کیا ہے۔ پھر افسوس ہے کہ جس چیز کی وجہ سے حصول بہشت کی ضرورت ہو اوسکو بہشت کے لئے چھوڑ دیں۔

لطیفہ مرزا کے شغل کا وقت تھا۔ کوئی پارسا دوست تشریف لائے کہا ایں قبلہ و کعبہ یہ کیا آپ شراب پیتے ہیں اس سے توبہ کیجئے۔ مرزا بولے بھئی کیوں۔ دوست صاحب نے فرمایا کہ ادنیٰ نقصان اسکا یہ ہے کہ چالیس روز تک دعا قبول نہیں ہوتی۔ جواب دیا کہ جب شراب پینے کو میرے پاس موجود ہے تو پھر اب دعا مانگنے کی ضرورت کونسی ہے۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

یہ مضمون بالکل پامال اور بتذل اور بے لطف ہے۔ یعنی میرا شیشہ پیمانہ کوزہ سبو سے کیا کام چلے گا۔ اگر دو چار خم بھی مل جائیں تو ہم چڑھا جائیں گے۔ یا یہ کہ شیشہ و قدح دیکھکر پینے کو جی نہیں چاہتا اگر کہیں ایک دو خم دیکھ لوں تب پیوں

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

اول تو مجھ میں طاقت گفتگو بھی نہیں رہی اور ہے تو اوس ستمگر سے کس امید پر کہوں کہ مجھے یہ حسرت ہے اسنے کونسے دن میری آرزو پوری کی ہے جواب کرے گا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

چونکہ آپ بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل ہو گئے ہیں تو اتراتے پھرتے ہیں وگرنہ غالب کو پوچھتا کون ہے

میں اونھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پئے ہوتے

میں انھیں چھیڑوں اور وہ سنکر خاموش ہو جائیں اور کچھ نہ کہیں بس یہی بڑی خیریت ہوئی کہ وہ اوس وقت پئے ہوئے نہ تھے ورنہ دھریت اڑانے لگتے۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاشکے تم مرے لئے ہوتے

میں نے مانا کہ تم سراپا قہر ہو یا بلا ہو میں یہ سب کچھ گوارا کرتا ہوں۔ بس اسے گوارا نہیں کرتا کہ تم دوسروں کے لئے ہو۔ کاش تم کسی حالت میں اور کچھ ہوتے مگر میرے لئے ہوتے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

اگر میری قسمت میں غم زیادہ تھا تو یا اللہ اسکے اٹھانے کے لئے کئی دل دیے ہوتے۔ کہ اگر ایک نہ رہتا تو دوسرا اسکی جانشینی کرتا۔ اس مضمون کو اگرچہ غالب نے بھی خوب کہا ہے مگر میر تقی میر کے یہاں اس سے بھی اچھا بندھا ہوا ہے۔ ایک شعر ایک دیوان ہے۔ اسکا جواب نہیں ہے۔

؎ کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں — ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب — کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

اے غالب تم مر گئے۔ ارے ابھی اور جیتے ایک نہ ایکدن وہ بھی راہ پر آ ہی جاتا۔ اسمیں معشوق کے جور و ستم کی زیادتی۔ اور اسمیں اپنی زندگی کے گذر جانے کا حسرتناک سین دکھایا ہے۔ دوسرا اسمیں طعن و تشنیع کا پہلو نکلتا ہے۔ کہ کیوں نہ ہم نہ کہتے تھے کہ ابتدائے عشق میں مر جاؤ گے تم نہ مانے اور اس امید پہ جیتے رہے کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور راہ پر آ جائیگا مگر آخر وہ راہ پر نہ آئے۔ اور تمھیں مرنا پڑا۔ کیوں مرے ابھی نہ مرتے۔ کسی نہ کسی دن وہ راہ پر آ ہی جائے گا۔ خوب شعر کہا ہے۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے — ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

اپنی حرماں نصیبی اور دوسروں کی خوش نصیبی کا نقشہ دکھاتا ہے کہ ہائے غیر تو شراب پئیں

اور ہماری کوئی بات بھی نہ پوچھے ۔ کسی کا شعر ہے ۔

ساقی نہ دے جو جام مئے لالہ فام کے — بیٹھا تو پینے دے ہمیں دیگ جام کے

در خور اگر نسیم مئے لالہ فام را — اے کاش تر کنند بہ بوئے مشام را

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ — ہتکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

ہم اپنے رنج و غم اور دل ٹوٹنے کی بابت آپ ہی سے کیا شکایت کریں ۔ یہ سب آسمان کے ہتکنڈے ہیں کہ وہ نئی نئی صورتیں ظلم و ستم کی نکالتا ہے ۔ اور نہیں تمہارے ہی ہاتھ سے رنج دلا دیا ۔ دراصل تمہارا کچھ قصور نہیں ہے ۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ کچھ مطلب ہی ہو تب تمھیں خط لکھیں تمہیں کچھ مطلب ہو یا نہ ہو خط ضرور لکھیں گے کیونکہ ہم تو محض تمہارے نام کے عاشق ہیں اسمیں اور نہیں تمہارے نام کی مشق تو ہوتی ہے ۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

یعنی رات کو شراب پی زمزم پہ بیٹھ کر اور صبح کو توبہ کر کے اسی کے پانی سے جامۂ احرام کے دھبے دھوئے ۔ خوب پی رات کو صبح کو توبہ کر لی ۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر — یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

میرے دل کو میری آنکھوں نے تمہارے عشق کے جال میں پھنسایا ۔ غالباً یہ میری آنکھیں نہیں تمہارے دام حسن کے حلقے تھے ۔

شاہ کی ہے غسل صحت کی خبر — دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

بادشاہ کے غسل صحت کی خبر اڑی ہوئی ہے ۔ دیکھیے کب حضور غسل صحت فرماتے ہیں اور

حمام کے اچھے دن کب آتے ہیں ۔

عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اے غالب ہمکو عشق نے بیکار کر دیا ورنہ ہم بھی کام کے آدمی تھے ۔

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

یہ غزل نہایت ہی صاف کہی گئی ہے ۔ یعنی پھر اس انداز سے بہار آئی ہے کہ آفتاب و ماہتاب تک تماشا دیکھ رہے ہیں ۔

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اسکو کہتے ہیں عالم آرائی

اے زمین کے رہنے والو دیکھو عالم آرائی اسکا نام ہے ۔

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — رو کشِ سطحِ چرخِ مینائی

کہ تمام آسماں کو مات کر رہی ہے بلحاظ سبزی کے ۔ یا بہ لحاظ اس بات کے کہ بہار نے اسکا مرتبہ بلند کر دیا ہے ۔

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ کی یہ کثرت ہے کہ جب زمین پر اسکو جگہ نہ ملی تو کائی کی صورت میں پانی پر جم گیا

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے — چشم نرگس کو دی ہے بینائی

صرف سبزہ و گل کے نظارہ کے لئے نرگس کی آنکھ کو بینا کر دیا ہے ۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادپیمائی

جب موسم نے ہوا میں شراب کی تاثیر پیدا کر دی ہے تو شراب پینا بالکل فضول ہے ۔